جوش بانی
جوشیات پر مشتمل ایک عالمی جریدہ

جوش بانی - ۱

مرتبین
قمر رئیس
اقبال حیدر

مدیر
علی احمد فاطمی

معاونین
فخر الکریم
نعیم السحر

Josh Bani - 1 (Jan-Jun '08)
Published by : Josh Literary Society (India - Canada)
Price : Rs. 50.00

مجلس مشاورت

جوش بانی-۱ جنوری تا جون ۰۸ء
کتابت : شارپ ٹریک کمپیوٹرز، الہ آباد (shadabmz@rediffmail.com)
طباعت : سٹی آفسیٹ پریس، الہ آباد
سرورق : شاداب مسیح الزماں
قیمت : ۵۰ روپے
پتہ : ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا
+9910153058 (دہلی) +9415306239 (الہ آباد)
+(403) 2410834 (کنیڈا)

زیر اہتمام
جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا، کنیڈا

ترتیب

اداریہ

جوش کی تلاشِ نو

کہوں کس سے میں یہ جا کر، مری قومِ بدگلو نے
مجھے قتل کر دیا ہے، بہ گناہِ خوش نوائی

جوش اپنے آپ کو ہمیشہ اپنی قوم کا ایک معتوب اور مغضوب انسان سمجھتے تھے۔ اگر چہ یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح کچھ لوگ اپنی مغفرت کا سامان جمع کرتے ہیں اُسی طرح جوش نے اپنی معتوبی کا سامان بہت پہلے سے جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی اہلِ ایمان کو بھڑکا کر کبھی اہلِ اقتدار کو آنکھیں دکھا کر، کبھی درجنوں عشق کر کے ہم چشموں کو حاسد بنا کر، کبھی درگاہوں اور خانقاہوں میں فتنے جگا کر، کبھی دیسی ریاستوں میں برہنہ گفتاری کے تماشے دکھا کر، کبھی مرگِ انسانیت اور تذلیلِ آدم کا نوحہ پڑھ کر، کبھی آدمِ نو کے آنے کی بشارت دے کر، کبھی (آزادی کے بعد) لال قلعہ کے مشاعرے میں آزادی کا مضحکہ اُڑا کر اور اربابِ حکومت کو اپنے روبرو للکار کر اور کبھی (۱۹۶۰ء میں) صدرِ مملکت ایوب خاں کو ایک نظم میں نصیحتیں کر کے ؎

آپ کو آگاہ کرتا ہے یہ رندِ بادہ خوار
قلبِ انساں کو سڑا دیتا ہے لمسِ اقتدار

کبھی ریڈیو کے لیے بدنامِ زمانہ انٹرویو دیتے ہوئے شعر و ادب سے سیاست کی دلدل میں چھلانگ لگا کر اور کبھی شاہ نامہ اسلام کو کڑی تنقید کا حدف بنا کر، کبھی ایسا طفلِ معصوم کہ خواب میں

پریوں سے ہم آغوش ہوتا ہے تو غسل واجب ہونے کا ذکر بھی آپ بیتی میں ضروری سمجھتا ہے، اور کبھی ایسا انا پرست کہ ہنگامِ طرب جبریل بھی اسکے پاس آکر پوچھتے ہیں........

''سرکار فلک کے نام کوئی پیغام''

الغرض یہی وہ اعمال تھے جو بیسویں صدی کے ایک عصر ساز اور باکمال تخلیق کار اور سچے دانشور کا مقدر لکھ رہے تھے۔ اور جس کے نتیجہ میں ان کی وفات فروری ۱۹۸۲ء کے بعد رسمی اور غیر رسمی تعزیتی جلسوں اور ماتمی تحریروں کے بعد برِ صغیر میں ایسا سناٹا محیط ہوا، ایسی فراموشی اور خاموشی چھائی جو اکثر کسی کی تدفین کے بعد شہرِ خموشاں سے واپس آنے والے تھکے تھکے سوگواروں کے چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔ اور جس کا سلسلہ جاری ہے۔ جوش اپنی زندگی میں ہونے والی مخالفت سے خائف نہیں تھے۔ اس کا جواب علمی استدلال سے وہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے لیکن سرحد کے دونوں جانب ان کی تاریخی خدمات اور بے مثل کمالات کے تئیں جس بے سبب اور بے ضمیر بے نیازی (INDIFFERENCE) کا رویہ اختیار کیا گیا اُس کا کوئی جواب یا مداوا ممکن نہیں تھا اور شائد سچ کہا گیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کو کچلنے اور اس کی اعلیٰ خدمات پر پانی پھیرنے کا یہ سب سے کارگر ہتھیار ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں جوش کے بارے میں کچھ سنجیدہ تنقیدی مضامین نہ لکھے گئے ہوں۔ بعض یونیورسٹیوں میں ان کی خدمات کے بارے میں ڈگری کے حصول کے لئے تحقیقی مقالے بھی ضبطِ تحریر میں آئے اور کچھ دانشگاہوں کے درسی نصاب میں بھی انھیں شامل کیا گیا۔ پاکستان میں صہبا لکھنوی اور شاہد احمد دہلوی نے (موخر الذکر نے منفی زاویہ سے سہی) جوش نمبر نکال کر جوش شناسی کا آغاز کیا لیکن اس کے بعد یہ روایت آگے نہ بڑھ سکی۔

جوش کے بزرگ معاصرین میں قومی سطح کے تخلیق کار پریم چند اور علامہ اقبال تھے۔ پچھلے سال ہندی کے ایک اسکالر نے اپنے پرچہ میں انکشاف کیا کہ ملک کی مختلف زبانوں میں پریم چند کے بارے میں چار ہزار تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ جن میں سے خاصی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہی حال دانشگاہوں اور اقبال شناسی کے اداروں میں اقبال کے کارناموں اور فکر و فلسفہ پر سنجیدگی سے لکھے ہوئے تحقیقی مقالوں کا ہے۔ ان مقالوں میں ان کے کارناموں کی قدر شناسی کے علاوہ یہ

جائزہ بھی لیا گیا کہ اردو، ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں کے افسانوی ادب اور شاعری پر ان عظیم فن کاروں کے جواثرات مرتب ہوئے ان کی نوعیت کیا ہے؟ معاصرِ شعروادب کے سرمایہ میں فکرونظر کی جونئی جہتیں اور نئے رجحانات سامنے آئے ان کی آبیاری میں ان فنکاروں کا کتنا حصہ ہے؟

ہندوستان میں پریم چند کے بارے میں جو اعلیٰ علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں ان پر ساہتیہ اکادمی اور دوسری اکادمیوں کے اوارڈ بھی تفویض ہوئے۔ یہی نہیں ہندی اور اردو میں پریم چند کی تصانیف کے کلیات بھی اہتمام سے شائع ہوئے۔ان کے متعدد ناولوں اور کہانیوں کی بنیاد پر معیاری فلمیں بنیں اور ڈرامے اسٹیج ہوئے اور اس طرح علامہ اقبال کی طرح پریم چند کو بھی نہ صرف جدید قومی تہذیب اور قومی ادب کے ممتاز معماروں کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہوا بلکہ نسل در نسل ان کے کمال وفن کا اعتراف ہونے لگا اور ان کی مقبولیت گھر گھر پھیل گئی۔

کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ بیسویں صدی کے منفرد اور اعلیٰ مقام شعرا کی صف میں جوش ملیح آبادی علامہ اقبال کے مرتبہ کے شاعر تھے۔ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت شائد اب تک کسی نے نہیں کی۔ ہرعہد کے ادیب اور تخلیق کار اپنا مقام لے کر آتے ہیں۔ان کا قد و قامت بھی الگ ہوتا ہے۔ان کی تخلیقی ہنر کی پستیاں اور بلندیاں بھی علیحدہ ہوتی ہیں لیکن پہچان کے اس فرق کی بنا پر کسی تخلیق کار کا معتوب کیا جانا اس کے کارنامہ کی قدر و قیمت سے منکر ہونا، ایک طرف خود اپنی جوہر شناسی سے محروم ہونا ہے تو دوسری جانب یہ رویہ خود اپنی تہذیب کی عمارت اور اپنے ادب کی وقعت کو کھوکھلا کرتا ہے۔اسے کم مایہ بناتا ہے۔اسباب کچھ بھی ہوں جوش ملیح آبادی کے ساتھ ہم نے جانے انجانے یہی رویہ اختیار کررکھا ہے۔ بے انصافیاں تو بڑے ادیبوں کے ساتھ پہلے بھی ہوتی آئی ہیں۔نظیرؔ اکبرآبادی اور مرزا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف مدتوں نہیں کیا جاسکا۔ انیس و دبیر کے مراثی کی تخلیق اور شاعرانہ عظمت بھی مولانا شبلی کے ''موازنہ'' کی منتظر اور محتاج رہی۔لیکن جوش جو علامہ اقبال کی وفات کے بعد ہجرت تک اپنی ہمہ گیر شہرت کے کمال وعروج تک پہنچ چکے تھے۔اچانک ان کی ہمہ جہتی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے آنے لگا۔ ہندوستان میں کچھ لوگ تھے جو ایک ''ملحد'' کے جانے اور اس سے نجات پانے پر خدائے برتر کا شکریہ ادا کر رہے تھے لیکن ان کے عقیدت منداور صاحبِ ذوق حضرات بھی ان کی اس نادانی اور بے وفائی پر

غم وغصہ سے تلملا رہے تھے۔ یہی بیزاری بے اعتنائی میں بدل گئی۔

دوسری جانب ہجرت کر کے جب وہ ارضِ پاک پہنچے تو وہاں ان کا استقبال کیسے ہوا؟ اس کی داستان خود جوش کی زبانی سنیئے۔

> ''میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ پورا پاکستان اور شہرِ کراچی تو اس قدر بلبلا اُٹھا گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہو۔ تمام چھوٹے بڑے اردو و انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادبا اور شعرا اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھر مار کر دی ....میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہو۔''

(ص۔۲۹۶۔یادوں کی بارات)

یہ تمام واقعات نصف صدی پہلے کا قصہ ہیں۔ آج ہم اکیسویں صدی کے صحن میں کھڑے ہیں۔ اردو زبان گرم اور مسموم ہواؤں کی زد میں ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں بنتا کہ ہم اپنے ان اکابرین کو از سرِ نو دریافت کریں جنھوں نے اردو زبان کو تخلیقی تزئین و رفعت عطا کی۔ اگر مرزا غالب اور علامہ اقبال نے اس کے سامنے فکر و معنی کے طلسماتی ابواب وا کر دیئے تو نظیر اکبر آبادی کی طرح جوش نے اُسے قومی زندگی کی کشمکش، غربت اور غلامی سے نجات کے لئے عوام کی جدو جہد، دقیانوسیت سے آزادی کی تگ ودو، اور سیکولر جمہوری، انسانی اقدار کی حرمت کا ترجمان بنایا۔ انسانی سماج اور تہذیب کے مسائل کی تفہیم اور ترجمانی کا یہ رجحان ہی تھا جسے اپنا کر اور آگے بڑھا کر ترقی پسند تحریک نے توانائی حاصل کی۔

یہ سچ ہے کہ جوش سماج میں انقلابی تبدیلیوں کے حامی تھے۔ انصاف پر مبنی ظلمت پرستی اور استحصال سے پاک ایک فلاحی معاشرہ کا وژن انکے سامنے ضرور تھا لیکن وہ کمیونسٹ پارٹی یا کسی بھی دوسری جماعت کے مصلحت پسندانہ فرمودات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے قائل نہیں تھے۔ سیاسی

بازی گروں کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے وہ کسی بھی دور میں اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ان کے محبوب رہنما پنڈت جواہر لعل نہرو ہوں یا صدر ایوب خاں وہ کسی کی گرفت میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ ادیب کے ضمیر اور قلم کی آزادی انکے موقف میں سب سے گراں قیمت سب سے ارفع تھی۔

کناڈا کے شہر کیلگری میں جوش کے ایک قدر شناس اور ہمارے عزیز دوست اقبال حیدر اکثر جوش پر مذاکرے اور ادبی محفلیں برپا کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً ربع صدی قبل انھوں نے اس شہر میں ایک جوش لٹریری سوسائٹی قائم کی تھی۔ وہ خود شاعر ہیں، نقاد ہیں، جوش سے عقیدت دراصل ان کو اپنے علم دوست والد بلکہ انکے خانوادے سے ورثہ میں ملی ہے۔ ان کی دو بہنیں شائستہ اور ناہید بھی (منجملہ دیگر افراد خاندان کے) جوش شناسی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ چند ماہ قبل جب ہم لوگ (پروفیسر علی احمد فاطمی) کیلگری میں ملے اور جوش کی از سرِ نو تلاش کے مسائل پر گفتگو ہوئی تو ''جوش بانی'' نام کے سہ ماہی مجلّہ کی اشاعت کی تجویز پر ہم سب نے نہایت جوشیلے ڈھنگ سے لبیک کہا۔ اقبال حیدر صاحب نے صاف لفظوں میں واضح کیا کہ ہمارا مقصد کسی جذباتی تحریک کے زیرِ اثر جوش کی عظمتوں کا سراغ لگانا نہیں بلکہ اس مجلّہ کے وسیلے سے جوش بے زاری یا بے اعتنائی کی اس فضا کو تحلیل کرنا ہے جو سرحد کے دونوں جانب دیکھی جاتی ہے۔ اور اس طرح جوش کے حقیقی منصب کی تلاش و تعمیر کر کے آہستہ آہستہ اسے اس طرح قائم کرنا ہے کہ جوش ہی نہیں بیسویں صدی کے ادب کی تاریخ کے ساتھ بھی انصاف ہو سکے۔

بس اس کے سوا ''جوش بانی'' کے اجرا کا کوئی دوسرا مقصد و مدعا نہیں ہے۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اہلِ قلم حضرات کو اس مجلّہ کے لئے لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ البتہ اگر کچھ نوجوان ادیب اس مہم سے تحریک پا کر جوش کا بالا ستیاب مطالعہ کر کے کوئی علمی کتاب لکھنا چاہیں تو ادارہ ان سے ممکنہ تعاون کرے گا۔

— قمر رئیس

☆☆☆

شبیر حسن خاں

مصطفیٰ زیدی

اے جوش میں افغان ہوں حسبِ نسب جسم
حسب نسبِ طبع ہوں منجملۂ سادات
(دقائق)

جوش ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت کی داستان اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ اردو شاعری سے میری مراد ان تمام اشعار سے نہیں جو انشاء سے لے کر ابن انشاء تک لکھے گئے۔ بلکہ اردو شاعری کے اس سرمائے سے ہے جس میں ایک روایت اور ایک تسلسل کا نشان ملتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی تہذیب سے میری مراد وہ ثقافت ہے جس پر ابھی وجودیت اور تجرید کی پرچھائیاں نہ پڑی تھیں، اور جو مغل سلطنت کے زوال کے باوجود، انگریزی حکومت کے دوران میں بھی اپنی قدیم آب وتاب محفوظ رکھ سکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خود اپنے حق میں اس بات کو ضروری اور مناسب سمجھا کہ اس ثقافت سے بالواسطہ جھگڑا مول نہ لیں۔ اسی لئے انگریزی زبان اور رسم الخط اور عیسائی مدرسوں کے باوجود ہم لوگ فارسی اور اردو سے یکسر منحرف نہیں ہوئے۔

دنیا کے اکثر ملکوں نے اس دوسو سال کے عرصے میں جس رفتار کا مظاہرہ کیا، اس کے

مقابلے میں ہم پس ماندہ رہے، لیکن بہ عجلت، یا بہ تاخیر، ان تمام تحریکات کا کچھ نہ کچھ ردِّ عمل ہمارے یہاں بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ڈارون اور کارل مارکس اور ریلوے انجن کی آواز ہم تک بھی پہونچی۔ یورپ میں ان آوازوں نے بڑی بڑی لہریں پیدا کی تھیں ہمارے یہاں اتنی بڑی لہریں تو نہیں اٹھیں، لیکن ثقافت کی سطح پر ارتعاش ضرور ہوا۔ اُس وقت ہمارا ذہنی معیار کچھ ایسا تھا کہ ہم میں سے بیشتر آدمیوں نے اس ارتعاش کو طوفاں، اور اس ہلچل کو بغاوت سمجھ لیا.........اور جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب کہے جانے لگے۔

اس انقلاب سے ہماری مراد کوئی بین الاقوامی تبدیلی، یا انسان کا چاند کو مسخر کرنا نہ تھا۔ بلکہ صرف انگریزوں کی حکومت سے بیزاری کا اعلان تھا۔ اس کے مقابلے میں اگر فرانس کے انقلاب یا سوویت انقلاب یا انگلستان کے غیر خونی انقلاب ہی کی داستانیں پڑھی جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نظریۂ انقلاب اور ان ملکوں کے نظریۂ انقلاب میں کتنا بنیادی فرق تھا۔ وہاں سوال محض ایک حکومت کی تبدیلی کا نہ تھا، بلکہ ایک معاشرے، ایک آئیڈیالوجی اور ایک پوری ثقافت کی تبدیلی کا تھا۔ یہاں ہم صرف اسی بات سے خوش ہونے لگے تھے کہ ہوم رول ملنے والا ہے، اور دو کانگریسی اور ایک مسلم لیگی ارباب حکومت میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ نظریہ ماسوائے چند بالغ نظر عالموں، اور لیڈروں کے، سب کا تھا۔ اس میں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹی کے طلبا اور پروفیسر، تاجر، دستکار اردو پڑھنے والے، سب شامل تھے۔

جوش کے انقلاب نے ہمیں اسی لئے اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیا کہ جس نظریے کو ہم ''بہت بڑی بغاوت'' سمجھتے تھے، اسے جوش نے بلند آواز، بلند آہنگ اور شعری شدت کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس طرح یہ ہوا کہ جوشؔ خود اپنے آپ کو ''انقلاب'' کا ''پیغمبر اور اپنے کلام کو صحیفہ سمجھنے لگے۔

اے روحِ عصرِ حاضر ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفہ سخن داں ترے لئے
اس مصحف عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر مد ہے مشرقین بہ داماں ترے لئے

(تہدیہ)

☆☆

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' وہ نظم تھی، جس نے بائرن کی چائلڈ ہیرالڈ (Childe Harald) کی طرح اپنے مصنف کو رات ہی رات میں مشہور کر دیا۔ اس نظم میں بھی کسی نظریے کا اعلان نہ تھا، بلکہ تاریخی پس منظر کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ اے فرنگی بھیڑیو! تم جرمن فاشزم کے ''گرگ دہن آلود'' ہونے کا کس منہ سے تذکرہ کرتے ہو جب کہ تمہاری اپنی تاریخ میں ''وارن ہیسٹنگز'' اور ''ڈائر'' کے نام موجود ہیں۔

لکھنؤ اور ملیح آباد کے نواب زادوں کی صحبت میں غالبًا اس سے بڑی بغاوت جوش کے لئے ممکن بھی نہ تھی۔ اسی پر اس زمانے میں یہ افواہیں آنے لگی تھیں کہ جوش صاحب گرفتار ہو گئے۔ اور جوش صاحب نے ''ہٹلر اعظم'' کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم لکھی ہے۔ جو عنقریب ''کلیم'' میں شائع ہونے والی ہے۔ جو لوگ ''کلیم'' کا بالاستیاب مطالعہ کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ ''کلیم'' کے ایک شمارے میں جوشؔ ملیح آبادی کے نام کے نیچے ایک عنوان ''تلاشی'' چھپا تھا اور نیچے نظم نہ تھی، بلکہ یہ اعلان تھا کہ پریس نے یہ نظم چھاپنے سے انکار کر دیا ہے۔

ان نظموں کی کامیابی کی وجہ متذکرہ بالا امور اور ملک کی سیاسی فضا کے علاوہ یہ تھی کہ بنیادی طور پر جوشؔ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ''نظریہ'' میں لگن کے علاوہ اس کے تمام پہلو بھی کھنگال ڈالیں۔ وہ شعری معائب و محاسن پہچان سکتے تھے۔ بغاوت کو گھن گرج کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ اور یہ غلط ہے کہ مدھم اور شبنمی لہجے میں اس کا ذکر ان کے لئے ناممکن تھا۔ جوشؔ کے نقادوں نے ان کے ساتھ بڑی بے انصافی یہی کی ہے کہ ان کے اس کمال فن کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ اشعار سنئے۔

بلقیس سے کہو کہ سر بارگاہ ناز
پریاں کھڑی ہیں تخت سلیماں لئے ہوئے

(زنداں کا گیت)

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

(وطن)

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

(شریک زندگی سے خطاب)

جوش کے لئے جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی آواز میں بندوق کی تاثیر بھر دیتے، وہیں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے لحن میں ڈھلتی ہوئی شاموں کے سائے پھیلا دیتے۔ لیکن کسی آئڈیالوجی سے جذباتی اور غیر جذباتی دونوں اقسام کی محبت بیک وقت ان کے لئے ممکن نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ۴۶ء....۴۷ء تک جوش ملیح آبادی جو نئے شعراء کے امام اور نئی نسل کے ہیرو تھے یکا یک بوڑھے اور قدیم معلوم ہونے لگے۔

اس نئی نسل کا ایمان ابھی ایمان مستحکم نہ تھا۔ جوش کے وہ مقلد شعراء جن سے خود شعر کے مستقبل کو امیدیں ہونے لگی تھیں۔ پھلجڑیوں کی طرح چمک چمک کر بجھ گئے۔ ان میں ایک طرف تو ہنگامی نمود کی خواہش تھی اور دوسری طرف جذبہ کی ناپختگی تھی۔

نتیجتاً میر سجاد اشناس لشکریاں شکستہ صف کا معاملہ ہوا، اور شدید ردِ عمل کے طور پر جوش کے جو محاسن تھے وہ بھی معائب نظر آنے لگے۔ میرے عزیز خلیل الرحمٰن اعظمی کا جو مضمون جوش پر ہے بلیغ اور جامع ہونے کے باوجود اس ردِ عمل کی غمازی کرتا ہے۔ صرف فیض احمد فیض نے اس بحران کے زمانے میں بھی جوش کے امتیازی سیاسی افکار کا جائزہ دیانت داری سے لیا تھا۔ فیض نے جو کچھ کہا تھا اس کا اعتراف خود جوش نے کیا ہے۔

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے
چند زلفوں کی سیاہی چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیر دارانہ بقولِ ناقداں
بے سوا دوستۂ رسم ورہِ رومانیاں
بے خبر تھا میں کہ دنیا راز اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیونکہ اب پیش نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
ایک منّا سا ستارہ ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار

(اعتراف عجز)

لیکن سیاست کے کھوکھلے پن کے ردعمل کے طور پر اگر ''کائنات کی تسخیر'' کا نسخہ استعمال کیا جائے تو ذہنی صحت کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتا اس کائنات میں بھی جوشؔ نے ''منے سے ستارے'' کی ماہیت سمجھنے سے قبل ہی ''خدا'' کو اپنا حریف اور مد مقابل بنالیا۔ اور ایک ایسی ذہنی جنگ مرتب کی جس میں ایک طرف دنیا بھر کے مولوی اور راحب اور برہمن تھے اور دوسری طرف وہ تن تنہا تھے۔ ان کے بقول اس جنگ میں مادّی فتح خدا کو اور روحانی فتح انہیں نصیب ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو امام حسین جیسا مظلوم اور ہر مولوی کو یزید سمجھنے لگے۔

فارسی میں قاآنی اور عرفی اور اردو میں انیس اور سودا کا جو مخصوص طریقہ اظہار تھا وہ جوشؔ کو ورثہ میں ملا تھا، اس ورثے میں شوکت وطمطراق کے علاوہ طنز استہزاء کی بے پناہ قوت بھی تھی۔ اس ذہنی جنگ میں جس حد تک ممکن ہوا، جوشؔ نے اپنی اس صلاحیت سے کام لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ''ایہاالناس'' کو مخاطب کیا۔

اے مردِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہات بڑھا
پڑھ کلمۂ لاالٰہ اِلّا انسان

پھر اپنے حریف کے لشکریوں کی تفصیل بیان کی۔

اپنے جسم عقائد پہ نہیں وہ گہنے
اب کوئی مجاور نہیں بائیں دہنے
بے چارے پڑے پھرتے ہیں مارے مارے
ٹوٹے جوتے پھٹی عبائیں پہنے

پھر جنگ اور مناظرے کا سماں پیش کیا ہے۔

تحقیق و تجسّس نہ دلیل و بُرہان
پھر بھی مذہب پہ مر رہے ہیں انسان
اب دین کی جھولی میں دھرا ہی کیا ہے
کج ضابطے، کھکھ صحیفے، کھکھل ایمان

پھر اس جنگ میں اپنی شکست اس طرح تسلیم کی ہے۔

اللہ ری بانیانِ ادیان کی آب
اُترا نہیں اب تک ان کا دریائے شباب
یہ ان کے ہی انفاس کی ہے سخت گرہ
ٹوٹے نہیں آج تک مذاہب کے حباب

اس شکست کے بعد، سوائے اس کے کیا باقی رہ گیا تھا کہ فاتح کے ذمائم اخلاق بیان کئے جائیں۔

ہے واقعی منتقم تو کھوٹا ہے خدا
سونا جس میں نہیں وہ گوٹا ہے خدا
شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا

اس ''جنگ'' کے بیان میں میں نے کسی کی طرف داری نہیں کی۔ میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کاش جوشؔ خدا کے سچے منکروں میں ہوتے تو ہمیں ان کے اس نوع کے کلام میں ٹوٹے جوتوں اور پھٹی عباؤں کے علاوہ بہت کچھ مل جاتا لیکن ابتدا سے اب تک کبھی جوشؔ ان سچے منکروں

کے حلقے میں شامل نہیں ہوئے۔ ''سنبل وسلاسل'' کی تمام رباعیوں اور ''عرش وفرش'' کی تمام نظموں کے باوجود جوشؔ صاحب کے الحاد کا ڈانواڈول ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ جوشؔ صاحب نے کارل مارکس کی شان میں ایک ڈھیلا ڈھالا قصیدہ بھی لکھا ہے، اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف داری بھی گاہ بہ گاہ کی ہے لیکن ان کے ہیرو نہ کارل مارکس بن سکے نہ جوزف اسٹالن، بلکہ ہمیشہ انہوں نے امام حسین کو اپنا قبلۂ نظر جانا اور مانا ہے۔ تاریخ میں امام حسین اور فطرت کی علامتوں میں صبح صادق... ان دونوں کے آگے انہوں نے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا ہے۔ اور یہ دونوں ان کے وجود کے رہبر رہے ہیں۔ جوشؔ کا المیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کو انہوں نے اپنی منزل نہیں جانا، بلکہ منزل کا سراغ دینے والا سمجھا ہے۔ اور یہ آخری منزل خود ان کے الفاظ میں خدا کی ذات ہے ؎

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات
اک کار ساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

(حسین اور انقلاب)

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی
زہاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسین
ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسین

اس سے ''حقا کہ بنائے لا الہٰ ہست حسین'' کے علاوہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار یا شاعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر کہانی یا ہر شعر سے کسی اخلاقی اصول کا سبق دے یا کوئی بات ''ثابت'' کرے۔ محض محسوسات کی تجسیم سے بلند شاعری وجود میں آسکتی ہے۔ اور اگر ''ثابت'' ہی کرنا ہے تو اس کے لئے حکیم کا طریق کار اختیار کرنا چاہئے نہ کہ مداری کا (خدا اور ''مذہب'' کی بات

تو درکنار، جوش کا یہی Mock T Heroic لہجہ اس وقت بھی برقرار رہا ہے، جب انہوں نے صنف غزل کولغو اور لچر ''ثابت'' کرنے کی کوشش کی ہے)

طویل نظم ''حرف آخر'' کے ابتدائی حصّوں میں جوش نے حکیم کا مسلک اختیار کیا بھی، لیکن اسی ''ثابت'' کرنے کی دھن کی وجہ سے وہ اس مسلک کو آخیر تک ریاض کے ساتھ قائم نہ رکھ سکے۔ تخلیق سے پیشتر سینۂ عدم میں وجود کے پیچ وتاب کی نزاکت کا اظہار جوش ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری اردو شاعری کے لئے قابل فخر ہے۔ اس طویل نظم میں جوش نے جب تک مروّجہ مذہب کے افکار و ہدایات کو نظم کیا ہے، تب تک وہ بلند ترین شعری پرواز سے نیچے نہیں اترے لیکن منظر ۱۵ کے وسط سے ہی پرواز کی تھکن ظاہر ہونے لگتی ہے۔ ابتدائی منظر کے اکثر مصرعے اور نثر کے ٹکڑے تو قرآن حکیم کی آیات کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

بارگاہ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار	وَ نَحنُ وَ نُسَبِّحُ بِحَمدِكَ وَ
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار	نُقَدِّسُ لَکَ ط البقر۔ منزل ،وع ۳
لیلئ اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں	قَالَ اِنّی اَعلَمُ مَالَا
جو ہے میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں	تَعلَمُونَ۔ البقر منزل، دع ۳
''ابلیس غرور سے گردن کو کج کیے ہوئے..''	اِلّا اِبلِیس ط اَبی وَا ستَکبَرَ
	وَکَانَ مِنَ الکَافِرِینِ ط

یہ نظم ابھی تک کہیں مکمل شائع نہیں ہوئی۔ اس کے کچھ حصے ''رامش و رنگ'' میں، کچھ ماہ نامہ ''آج کل'' میں اور کچھ ماہ نامہ ''ساغر'' میں چھپے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی ہے کہ جوش صاحب نے اپنی پرانی نظموں، غزلوں کے ٹکڑے جا بجا چسپاں کر کے نظم کا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ مثلاً ''حوروں کا ترانۂ مبارک باد'' اس نظم کے تقریباً دس سال قبل ایک غزل کی صورت میں شائع ہوا تھا، اور مندرجہ ذیل دو شعر جواب نظم میں شامل نہیں، اس وقت غزل میں شامل تھے۔

گدائے رہ نشین و بے نوا کو
غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک
جناب جوش کو یہ کامرانی

بہ فیضِ قربِ درویشاں مبارک

منظر ۱۴ میں ابلیس کا نعرہ ''جنون وحکمت'' میں علیحدہ رباعی کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

خود کو گم کردہ راہ کرکے چھوڑا
حوّا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے حضور والا نے جتن
آدم نے مگر گناہ کرکے چھوڑا

اصل رباعی میں تیسرا مصرع ذرا سے اختلاف کے ساتھ یوں تھا۔

کیا کیا نہ کئے خدانے جنّت میں جتن

میں نے ابھی ابھی محسوسات کی تجسیم کا ذکر کیا ہے۔ اس نوع کی شاعری میں جوشؔ ملیح آبادی کا اردو ہی میں نہیں، بلکہ ساری دنیا کے ادب میں کوئی حریف نہیں۔ ڈرامائی کیفیات، نازک سے نازک آبگینے میں تیز سے تیز شراب کو ڈھال دینا جوش کے اختیار میں ہے۔ اسی نظم کے منظر ۱۳ میں خالص جنسی ہیجان کو جس خوب صورتی سے جوشؔ نے نظم کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں
یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں
بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے
کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے
آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم و سرد
پنڈے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزے کا درد
رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں
پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری
پہلو سے زلف مَس ہو تو آتی ہے جھرجھری
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن

معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

''پہلو سے زلف مَس ہو تو آتی ہے جھرجھری'' کی کیفیت کو جوشؔ سے کم رتبے کا کوئی شاعر بیان کرے تو یا وہ سپاٹ ہو کر رہ جائے گا یا فحش اور ابتذال کے دائرے میں آ جائے گا۔

جنسی جذبے کے بارے میں جوشؔ کے کلام میں کوئی Taboo نہیں ہے۔ ''روحِ ادب'' اُن کا پہلا اور واحد مجموعۂ کلام ہے جس میں انہوں نے محبت میں روحانیت کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جن کا کوئی روحانی ترجمہ ممکن نہیں۔ مثلاً

رنگیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر
مرنے کو اور جائیے پنجاب میل پر

رفتہ رفتہ انہوں نے نہ صرف روحانیت کا دعویٰ ترک کر دیا، بلکہ محرکات عشق سے روحانی عمل کو یکسر خارج کر دیا۔

مگر یہ اب پول کھل چکا ہے
کہ عشق ہیجان جسم کا ہے
نہ عشقِ اعلیٰ نہ عشقِ احسن
فقط اک اعصاب کی ہے اینٹھن

(سراب)

بہ ظاہر اعصاب کی اینٹھن کی شاعری سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں، اور بڑے بڑے قادر الکلام شاعر مثلاً فراقؔ گورکھپوری، اس ضمن میں اپنے دامن کو چھینٹوں سے نہ بچا سکے۔ لیکن جوشؔ کا کلام روڈین (Rodine) اور ہنری مور (Henry moor) کے سنگِ مرمر کے برہنہ مجسموں کی طرح دودھ میں دھلا ہوا اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں چبھن ہے کسک ہے، داغؔ اور جراؔت کے مضامین بھی ہیں، معاملہ بندی بھی ہے، لیکن لذتیت نہیں بلکہ جمال ہے۔ یہ کسک کتنی شدید ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جس حسن نے یہ کسک پیدا کی ہے وہ کتنا قابل پرستش ہو گا۔ جوشؔ کے کلام میں اس جمال کی جھلکیاں ہیں لیکن ان کا کلام سنگار رس کا کلام نہیں جیسا کہ ''روپ'' کی رباعیاں ہیں۔

جوشؔ کے یہاں حسن سے زیادہ اہمیت اس تعلق کو دی گئی ہے جو حسن کی ذات سے ہے، اور یہاں وہ اپنے ہیرو خود بنے ہیں۔ ان کی محبت غالبؔ کی محبت کی طرح ہے جو مار کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن غالبؔ کی محبت میں جو کائناتی شعور اور ژرف بینی تھی وہ جوشؔ کے یہاں نہیں ہے.... اور نہ محبت کے وہ سوانگ ہیں جو غالبؔ کی غزلوں میں رچے ہوئے ہیں، یہ محبت ایک باوقار افغان مرد کی محبت ہے۔ اس میں حوصلہ، امنگ اور مردانگی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امنگ کا سنگ و آہن کی طرح گراں ہونا عیب معلوم ہونے لگتا ہے پچھلے پانچ چھ سال کے کلام میں پسپائیت کی جو مدھم سی لکیر جوشؔ کے یہاں ملتی ہے وہ اپنے ماہ و سال کی رفتار سے ہے۔ اس بات سے ہے کہ ''ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ'' اس کی سب سے اچھی مثال ان کی نظم ''ژالہ باریاں ہے۔ جس کے چند شعر سنتے چلئے۔

کل تک یہ جشن تھے کہ مرے در پہ رات کو
رکتی تھیں گیسوؤں سے مہکتی سواریاں
اور یہ بھی وصف تھا کہ مرے اشتیاق میں
آتی تھیں بیاہیوں سے زیادہ کنواریاں
دیتا تھا قرض ماہ وشوں کو سرور شعر
اور اس کی آڑ میں تھیں بڑی سودخواریاں
اب بے دلی کے دشت میں بنتا ہوں خار و خس
کل تتلیوں کے رنگ میں چنتا تھا دھاریاں
سب سے زیادہ خوف ہے اس بات کا مجھے
دم توڑ دیں کہیں نہ مری وضع داریاں
مجھ کو بھی ایک روز بالآخر ڈبو نہ دیں
مجھ سے فقیہہ شہر کی یہ غم گساریاں

(ژالہ باریاں)

اسی خیال کو وہ بار بار دہراتے ہیں، کبھی نظموں میں، کبھی رباعیوں میں، کبھی مثنویوں میں۔ رباعیوں میں جوشؔ نے ایک ہی خیال پر مسلسل رباعیاں لکھی ہیں۔ اور ہیرے کے ہر رخ کو

چمکایا ہے۔ بنیادی تصور یہی ہے کہ جوانی کا کس بل نکل جانے کے بعد چونکہ محبت میں شدّت نہیں رہ جاتی اس لئے زندگی موت سے سردتر بن جاتی ہے۔

کب راکھ پہ گرتے ہیں زمانے والے
شعلوں سے ہیں لاکھ لو لگانے والے
بوڑھا ہو کر وفات پاتا ہے جو عشق
ملتے نہیں اس کی لاش اٹھانے والے

ایک خیال کو مسلسل اور طرح طرح نظم کر سکنے کی قوت نے جوشؔ کے مجموعوں کی تعداد میں تو اضافہ کر دیا لیکن بنیادی مضمون چند ایک ہی رہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں کوئی موضوع نیا نہیں ہے۔ لیکن جوش کے عام موضوعات وہ تھے جو اس سے قبل سیکڑوں نظموں اور ادبیات کے عام موضوعات بن چکے تھے۔ قاآنی کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے جوشؔ نے بھی مناظر قدرت، مناظر کوہ، دریا، پہاڑ، چشموں، گھٹاؤں اور ساونوں کا تذکرہ اسی ٹھاٹ سے کیا ہے جیسا کہ

''نسیم خلد می وزد مگر ز جویبارہا

میں ہے۔ ان کی نظم:

''بادل اٹھے ہیں دل کے دل

اسی طرح گونجتی، برستی، آگے بڑھتی ہے۔ جیسے دربار کے عام قصیدے ہوا کرتے تھے۔ اس سے محض جوشؔ کی قادرارلکلامی کا نہیں بلکہ اس مخصوص ذہنی فضا کا پتہ چلتا ہے جس سے ان کے مزاج کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس مزاج پر لکھنؤ کی آب و ہوا کا اثر بھی ہے اور خاندانی نشو و نما کا بھی۔

''اپنے فلسفۂ زندگی'' پر جو تقریر انہوں نے دہلی ریڈیو سے نشر کی تھی اسے پڑھئے تو ہر چند اس میں انہوں نے اپنے خاندان، وراثت اور ماحول کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا، لیکن اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی پشت پر شبیر حسن خاں بول رہے ہیں:

''ابھی ہمیں۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں لیکن..... ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چاروں کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بے شک .... ایک جانباز سپاہی کی

طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر
روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے......دن کے وقت ہم
ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائیں گے،اور رات کو جب..........ستاروں کی خنک
روشنی ہمارا احاطہ کرے گی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں منائیں گے۔''

اسی بات کو چھ سات سال بعد جوشؔ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

دن بہادر کا بان، بیر کارتھ
رات چمپا کلی، انگوٹھی، نتھ
(پند نامہ برائے میاں مجاز....)

جوشؔ موضوعات کی تنگی اور بیان کے ابلاغ کو کمزوری نہیں، بلکہ ہنر جانتے ہیں، بلکہ ان کو نئی نسل سے شکوہ یہی ہے کہ یہ نسل:

''شاعری میں بیان ہے سب کچھ''

کی ڈاکٹرن (Doctrine) کو غلط سمجھتی ہے انگریزی شعراء میں یہی فلسفہ پوپ اور اس کے بعد ۔بائرن کا تھا۔بائرن کے یہاں بھی بیان ہی بیان ہے۔لیکن بائرن نے کہیں کہیں عمیق بصیرت کی نشانیاں بھی دی ہیں،مثلاً دنیا کے متعلق اس کا یہی ایک مصرع:

Don Juon saw that

Micriocasm on stilts

جوشؔ کے یہاں بھی اس بصیرت کا امکان تھا،اگر وہ خدا اور مولوی کے جھگڑے میں نہ پڑ گئے ہوتے۔یا اگر ان کے یہاں ذاتی عمل کم از کم اتنا بھی ہوتا جتنا بائرن نے یونان کے بارے میں دکھایا تھا۔جلال و جمال،رحم وانصاف،عدل و معدلت،عصمت و رحمت،ہر موضوع پر انھوں نے ایک طرف ''خدا'' کو اور ایک طرف ''شبیر حسن خاں'' کو مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے۔

د رائے دو عالم کو نہیں فرصت رحمت
بیر حسن خاں کو یہ معلوم نہیں ہے
(لاعلمی)

میں جوشؔ کی ذات کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں، اس کا ذکر کسی اسکیچ میں کروں گا۔

یہاں یہ بات ضمنائیوں آ گئی ہے کہ جوشؔ نے ناقد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ؎

وہ داغِ سینۂ شاعر کو دیکھ سکتے کاش
جو لوگ شعر کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

(غزل ۱۹۲۵ء)

اس فلسفے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جس طرح بائرن تمام انگریزی رومانی شاعری سے علیحدہ اور تنہا رہ گئے تھے اسی طرح جوشؔ یکا یک نئی نسل سے علیحدہ ہو کر تنہا رہ گئے۔

جوشؔ کے یہاں بیان کی وسعت اور ایک طرز کے مضمون کو سو رنگ سے بندھا ہوا دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ جوشؔ اپنی قادرالکلامی کی وجہ سے جس رفتار سے لکھنا چاہتے ہیں لکھتے ہیں، اور الفاظ ان کے آگے سربستہ کھڑے رہتے ہیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ جوشؔ کے لئے درست نہیں بلکہ کسی شاعر کے لئے بھی درست نہیں ہو سکتی۔ جوشؔ اپنے اشعار کو نکھارنے اور سنوارنے، اور ایک ایک لفظ کی پرکھ پر ویسی ہی محنت کرتے ہیں جیسی فرانسیسی ناول نگار فلابیر کے بارے میں مشہور ہے۔

مثلاً یہ رباعی ؎

اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں
احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں
خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل
دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

مسودے کے ایک صفحے کا عکس ملاحظہ ہو:

جن کے نزدیک سر خوشی ہے طاعون
بھاتی ہے انہیں نفس کشی کی افیون
یہ قوم اگر سونگھ لیں بھنولے بھی پھول
بھل بھل بہنے لگے وہیں ناک سے خون

اچھے میں جو دل کشی نہیں پاتے ہیں
اپنے میں جو روشنی نہیں پاتے ہیں
اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں
احباب کے چہروں احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں
خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل
دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

اس میں صرف لفظ ''تنویر'' کی تلاش میں انہوں نے کئی مصرعے تبدیل کئے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں، انکی نظر سے اکثر ایک جیسے معنوں کے بے شمار الفاظ ایک جگہ لکھے ہوئے ملیں گے۔ جن کو جوش نے وقت صرف کر کے بڑی محنت سے، ڈکشنری میں سے تلاش کیا ہے۔ بقول فلابیئر ڈکشنری میں ایک معنی کے لئے صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کی فہرست میں سے جوش کی نظر بھی اسی ایک لفظ کو ڈھونڈتی ہے

انگریزی میں کلمۂ تعریف کے استعمال کا ایک تیر بہدف طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر اردو میں آپ ''سفید'' رنگ کے لئے دوسرے الفاظ تلاش کریں تو تین چار الفاظ کے بعد لغت خاموش ہو جائے گی۔ انگریزی میں اس ایک رنگ کے ہر عکس کو مماثلت کے ساتھ پیش کرتے جایئے تو سیکڑوں الفاظ نکل آئیں گے۔ مثلاً Snow -White''Ivory White'' '' وغیرہ وغیرہ۔ جوش نے انگریزی کے اس نسخے کو اردو میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش محض ''رنگوں'' کے لئے محدود نہیں، بلکہ جذبے کی مختلف کیفیتوں کی آئینہ دار ہے۔ مثلاً

جولیس سیزر کی خوں آلودہ حیرت کی قسم
اور نوائے ذہن میں خود رحمیاں

مجاز مرحوم کی طبیعت کو وہ ''آب صفت'' کہا کرتے تھے۔ اور تشریح اس کی یہ تھی کہ اگر پانی میں آپ چھڑی ڈالئے تو پانی فوراً جگہ دے دیتا ہے لیکن چھڑی ہٹاتے ہی پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہے۔ مجاز کو کثرت شراب کی ممانعت کرتے رہئے تو چپ بیٹھے رہتے ہیں اور سنے جاتے ہیں، اور جہاں نصیحت ختم ہوئی وہ فوراً مے خانے کا رخ کرتے ہیں

ایک ماحول کی بھرپور عکاسی کے لئے وہ اکثر یہ بھی کرتے ہیں کہ اس منظر سے متعلق جتنے احساسات ہیں انہیں ایک جگہ جمع کردیتے ہیں۔

ناقوس، گائے باجے، تماشے، جلوس، اذاں
بنوٹ، کمند، پینترے، بانا، تبر، سناں
ملاّحیاں، جھکاتیاں، آوازے، اوکھیاں
غل، شور، دھینگا مشتیاں، لٹھ بونگا، ماردھاڑ
گلیاؤ، لام کاف، دھما چوکڑی، لتاڑ
پتھراؤ، داؤں پیچ، اچھل کود، دھر پچھاڑ
(وقت کی آواز)

مروجہ زبان، علاقائی زبان، اور روزمرہ سے وہ برابر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان کے کلام میں Dialect بھی ہے اور Latois بھی۔عورتوں کی بول چال پر بھی انہیں ویسی ہی مہارت ہے جیسی مردانے پر ہے۔اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ خود ان کا گھر اور ان کے بچپن کے لکھنو کا ماحول ہے۔ لیکن اس میں ساتھ ہی ساتھ ان کا ریاض اور ناقابل یقین مشقت بھی شامل ہے۔

جس طرح ہماری زندگی سے یہ مشقت علیحدہ ہوتی جارہی ہے
اسی طرح ہماری شاعری سے بھی۔ جدید تیز رفتاری کے سیاق وسباق میں ممکن ہے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے لیکن ہماری روایتی تہذیب کی کڑیاں اسی طرح ایک دوسرے سے ٹوٹتی جاتی ہیں۔

جوشؔ واحد شاعر ہیں جنہوں نے اب تک اس زنجیر کو وابستہ و پیوستہ رکھا ہے۔اور ہماری نسل میں دوسرا کوئی شاعر نہیں جو اس خانۂ زنجیر کو بے صدا ہونے سے بچا سکے۔

☆☆☆

شاعر انقلاب

ڈاکٹر عبادت بریلوی

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی سے دور رہیے تو ان کی بارعب اور پرُ وقار شخصیت دل میں ایک طرح کے اجنبی سے خوف اور انجان سے ڈر کو پیدا کرتی ہے اور اگر ان سے قربت حاصل کر لیجئے تو ان کی شخصیت کی گھلاوٹ اور نرمی' حلاوت اور شیرینی پر پیار آنے لگتا ہے۔

میں انہیں ایک زمانے میں دُور سے دیکھتا رہا ہوں۔ اسی لئے طالب علمی کے زمانے میں بھی (جب شاعروں کو چٹکیوں میں اڑا دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا) ان کی شخصیت کا رعب مجھ پر چھایا رہا ہے۔ ان سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی ہے، لیکن میں ان سے مل نہیں سکا ہوں۔ میں نے ان سے ملاقات کے پروگرام بنائے ہیں لیکن ایک اجنبی سے خوف اور ایک انجان سے ڈر نے ہمیشہ میرا راستہ روک لیا ہے لیکن اپنی طالب علمی کے بعد جب میں ان کے قریب ہو گیا ہوں تو اس ڈر اور خوف کی جگہ ایک موانست نے لے لی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کی شخصیت کو حد درجہ دلکش اور دلآویز پایا ہے۔ ان سے ملنے میں ہمیشہ ایک لذت سی محسوس کی ہے اور آج میں اس موانست کو اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس نے مجھے شاعر انقلاب کی رنگا رنگ شخصیت کے ان گنت پہلوؤں سے روشناس ہونے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے انہیں پہلی بار قیصر باغ میں دیکھا تھا۔ وہ قیصر باغ سے

امین آباد کی طرف جا رہے تھے میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ قیصر باغ سے امین آباد تک میں ان کے پیچھے پیچھے صرف اس خیال سے گیا تھا کہ کسی جگہ موقع پا کر ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ بس خود ہی اپنا تعارف کرا دوں گا اور اسی طرح ملاقات کی تقریب نکل آئے گی لیکن پھر یہ خیال آیا کہ میری حیثیت ہی کیا ہے میں تو ایک اسکول کا معمولی سا طالب علم ہوں۔ میں نے شاعر انقلاب کی نظمیں پڑھی ہیں، ان کا بہت سا کلام مجھے زبانی یاد ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں اس رشتے کو ان سے سر راہ ملاقات کا ذریعہ بناؤں۔ میں یہی سوچتا رہا کہ وہ کہیں گے کہ یہ عجب لڑکا ہے۔ آخر اس کو مجھ سے ملنے کی ایسی کیا پڑی ہے...... بس اسی خیال میں راستہ طے ہو گیا۔ وہ امین آباد پہنچ کر ایک ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ جھجک میری راہوں میں حائل رہی، اور میں ان سے نہ مل سکا......
اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لاٹوش روڈ کے ایک مشاعرے میں اپنی نظم 'جنگل کی شہزادی' سنا رہے ہیں۔ وہ نظم پڑھ چکے، رباعیاں سنا چکے، مشاعرہ ختم ہو گیا۔ لوگوں نے انہیں گھیر لیا لیکن اس دفعہ پھر ان سے ملنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اور اسی طرح نہ جانے کتنے ہی مواقع ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ان کو دیکھا لیکن ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ ان سے ملنے کو جی چاہا لیکن ایک زمانے تک یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی وہ لکھنؤ آتے رہے۔ میں بھی دیکھتا رہا، کلام سننے کا موقع ملتا رہا لیکن ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

جوش صاحب کو لکھنؤ سے عشق تھا۔ لکھنؤ کی ہر چیز کے وہ دلدادہ و شیدا تھے۔ اس لئے اکثر دلّی سے ان کا لکھنؤ آنا رہتا تھا چنانچہ ایک دفعہ ملاقات کی صورت نکل ہی آئی۔ میں ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے جو جوش صاحب سے وطنی نسبت رکھتے تھے۔ ملاقات کی صورت نکالی۔ وہ جوش صاحب سے وقت مقرر کرآئے اور ہم دونوں مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ ایک بڑے سے کمرے میں صوفے کے بجائے فرش پر بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ اس طرح جیسے برسوں سے جانتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی انھوں نے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مزاج پوچھا۔ حالات دریافت کئے۔ بات میں سے بات نکلی تو ملیح آباد، شاہجہاں پور، بریلی، رامپور اور قائم گنج کے پٹھان خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے کیونکہ اس وقت پٹھان ہونا ہی ہم دونوں

کے درمیان مشترک تھا پھر شعر وشاعری کی باتیں ہوئیں۔ یونیورسٹی کے ادبی ماحول اور لکھنؤ کی قدیم ادبی صحبتوں کا ذکر رہا.....اوراس طرح ان گنت موضوعات پر جوش صاحب ہم سے دیر تک بات چیت کرتے رہے، ان باتوں میں ماضی کی پرانی یادیں تھیں۔ حال کے معاملات ومسائل تھے، مستقبل کے سہانے خواب تھے......لیکن ان سب کو پیش کرنے میں ایک بذلہ سنجی تھی جس نے ہر بات کولطیفہ بنا دیا تھالیکن ان لطیفوں سے ماحول کے وقاراور رکھ رکھاؤ کوٹھیس نہیں لگی تھی۔اس فضا میں خاصہ لئے دیئے رہنے والا انداز تھا......کئی گھنٹے کی ایسی دلچسپ ملاقات کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے۔ جوش صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں اس ملاقات سے بہت خوش تھا کیونکہ آج میں ایک عظیم اور ہمہ گیر شخصیت سے ملا تھا اور اس شخصیت نے جو مانوس فضا پیدا کی تھی۔اس نے میرے لئے آئندہ بہت سی ملاقاتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات میں وہ موانست جس کا احساس مجھے پہلے دن بھی ہوا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی ہے۔ جوش صاحب کے اخلاق کو میں نے روز افزوں ہی دیکھا ہے۔درحقیقت یہ موانست ان کے اسی غیر معمولی اخلاق ہی کے ہاتھوں پیدا ہوئی ہے، جس کی وجہ سے کوئی بھی ملنے والا ان کے سامنے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔

شاعر انقلاب اخلاق کا مجسمہ ہیں بے شمار لوگ ان سے ملتے ہیں۔وہ ہر ایک کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے ہیں اور ایک لمحے کو بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ظاہر ہے اتنے بہت سے لوگوں کی جان پہچان آسان بات نہیں۔وہ ان میں سے اکثر کو نہیں پہچانتے۔لیکن ملتے وقت احساس سب کو یہی دلاتے ہیں گویا انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے......جب بھی کوئی ان سے ملنے آتا ہے۔کھڑے ہو کر اس کو گلے لگاتے ہیں۔

پھر پوچھتے ہیں کہیئے صاحب مزاج تو اچھا ہے؟ کہاں رہے؟ کیسے رہے؟ کیا کر رہے ہیں؟ قیام کہاں ہے؟ زمانے سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟۔اس سوال و جواب سے کچھ معلومات انہیں ہو جاتی ہے اور پھر اس معلومات کو سامنے رکھ کر وہ مزید سوالات بنا لیتے ہیں۔غرض ملنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جوش صاحب کو اس کے تمام حالات کا علم ہے اور اس لئے وہ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا......برخلاف اس کے ایسے مواقع پر تو جوش صاحب اس کے سب سے بڑے مونس وغمخوار بن

جاتے ہیں.......حالانکہ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد ان سے پوچھئے کہ یہ کون صاحب تھے؟ ......تو یہی جواب ملے گا کہ "بھئی بالکل یاد نہیں۔ میں انہیں پہچان نہ سکا۔"

ایک دفعہ مجھے اب تک یاد ہے!

میں ایک دن جوش صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان ملنے آگئے۔ جوش صاحب نے انہیں ایک ذرا دیکھا.......اور پھر فوراً کہا:

"آیئے، تشریف لائیے!"

"حاضر ہوتا ہوں۔"

"بہت زمانے کے بعد دیدار ہوا۔"

"کیا عرض کروں میں پچھلے دنوں کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا گیا تھا۔"

"لیکن حضرت! یہ آپ چپ چپاتے کہاں چلے جاتے ہیں؟"

"کیا عرض کروں بات ہی کچھ ایسی تھی۔"

"لیکن صاحب! کم از کم خط تو لکھا کیجئے۔"

"جی ہاں یہ میری غلطی ہے....... بات یہ ہوئی کہ بہت مصروف اور پریشان رہا۔"

".........اچھا آپ کے والد صاحب تو اچھی طرح ہیں؟"

"بفضلہٖ، خیریت سے ہیں؟"

".........اور ہاں آپ نے شادی کر لی یا نہیں؟"

"بس اب تیاری ہو رہی ہے۔ والدہ کا اصرار ہے۔ سوچتا ہوں کر ہی ڈالوں۔"

"جی ہاں! والدہ کی بات آپ بھلا کس طرح ٹال سکتے ہیں۔"

"اچھا، مکان وغیرہ تو ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"ہے تو ٹھیک لیکن مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔"

"بڑی لعنت ہے صاحب ! یہ مقدمہ اور عدالت بھی۔ میں تو اپنی ساری جائیداد ان عدالتوں اور کچہریوں کی نذر کر چکا۔"

".........اچھا اب کب تک قیام رہے گا؟"

''تو پھر ملاقات تو ہوتی رہنا چاہیئے ....آخر یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ایک شہر میں رہتے ہیں اور ملاقات نہیں ہوتی ....کبھی کبھی ضرور آئیے۔''

غرض اس طرح کی نہ جانے کتنی باتوں کے بعد جب وہ صاحب رخصت ہوئے تو میں نے پوچھا۔

''جوش صاحب ! یہ کون صاحب تھے؟''

جوش صاحب کہنے لگے...... ''بھئی خدا جانے ۔ میں انہیں پہچان نہ سکا۔ کہیں دیکھا ضرور ہے۔''

میں نے کہا..... ''لیکن آپ باتیں تو اس طرح کر رہے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہے۔''

کہنے لگے'' جی ہاں خاصی گاڑھی چھن رہی تھی ۔''

مجھے اس فقرے پر ہنسی آ گئی ۔ جوش صاحب بھی ہنسنے لگے۔

میں نے کہا......جوش صاحب ! آپ کمال کرتے ہیں ۔ وہ شخص سمجھتا ہوگا۔ آپ نے اس کو پہچان لیا ہے اور آپ اس کے حالات سے بخوبی واقف ہیں ۔''

جوش صاحب کہنے لگے...... ''نہ پہچاننا بھی تو بداخلاقی ہے اس لئے میں کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ میں نے اس کو نہیں پہچانا ہے۔'' بلکہ جوش صاحب تو یہاں تک کرتے ہیں کہ کوئی صاحب آئے اور انہوں نے آتے ہی کہا.....شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ ....تو وہ اس کے جواب میں فوراً کہیں گے ....نہیں صاحب بخوبی پہچان لیا ۔ بھلا آپ کو کون بھول سکتا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے بارے میں مطلق نہیں جانتے کہ کون صاحب ہیں۔

اس سے ان کی خوش اخلاقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہر وقت وہ اپنے اقوال اور افعال سے اس اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی یہ خوش اخلاقی تکلف کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ دلّی میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں دفتر میں ان سے ملنے گیا ہوں ۔ دو ایک گھنٹے بیٹھ کر رخصت چاہی ہے ....لیکن انہوں نے پوچھا ہے...... '' آپ کالج ہی کی طرف جائیں گے نا؟''

میں نے کہا ہے ''جی ہاں جانا تو اسی طرف ہے۔''

''تو پھر آیئے گاڑی میں بیٹھئے۔ میں بھی اسی طرف جار ہا ہوں۔''

اور یہ کہہ کر انھوں نے مجھے گاڑی میں بٹھالیا ہے اور ٹھیک اجمیری دروازہ پر لا کر اُتارا ہے اور اتار کر پھر مکان واپس گئے ہیں۔

اس اخلاق کے نمونے اب کہاں مل سکتے ہیں؟

شاعر انقلاب کو یہ خوش اخلاقی ورثے میں ملی ہے۔ وہ نسلاً پٹھان ہیں اور پٹھان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مہمان پر جان دیتا ہے اس کے علاوہ اس میں اودھ کے اس ماحول کو بھی دخل ہے۔ جس کے سائے میں انہوں نے پرورش پائی اور جہاں خوش اخلاقی تکلفات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ویسے وہ خود ان تکلفات کے قائل نہیں ہیں کیونکہ بے تکلفی ان کے مزاج کا جزو ہے لیکن خوش اخلاقی ان کے یہاں کہیں کہیں تکلف کو پیدا ضرور کر دیتی ہے۔ البتہ ان کا یہ تکلف تمام تر مصنوعی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو تکلف کہنا بھی زیادتی ہے۔

جوش صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ مجھے حد درجہ حساس اور جذباتی نظر آئے ہیں۔ خاص طور پر احباب کے معاملے میں تو وہ بے حد حساس اور جذباتی ہیں ...... بھی وہ سفر پر جاتے ہوں اور احباب کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہو تو ان کی کیفیت دیکھنے والی ہوتی ہے بس آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے، ورنہ ان کی ہر بات اور ہر انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ان پر رقت طاری ہے اور بس اب آنکھیں ڈبڈبانے ہی والی ہیں .... اگر کسی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو کہیں گے، ''نہیں صاحب ! معانقہ کریں گے۔ گلے ملیں گے خدا جانے اب کب ملاقات ہو؟'' مشیت، ہم سب کی گھات میں ہے۔'' اور یہ کہہ کر ہر ایک کو گلے سے لگائیں گے۔ بار بار فرطِ شوق سے بھینچیں گے۔ دیر تک یہی کیفیت رہے گی۔ اس منظر کے بغیر ان کے یہاں رخصت ہونے کا تصور ہی نہیں ہے .... جوش صاحب کے یہاں باتیں محض رسمی اور بناوٹی اور دکھاوے کی نہیں ہیں۔ اس عالم میں ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز سے بے پناہ خلوص ٹپکتا ہے بے اندازہ صداقت مترشح ہوتی ہے۔

ان کے دوستوں میں سے اگر خدانخواستہ کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو بس یوں معلوم

ہوتا ہے جیسے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ایسی صورت میں ان پر ایک کرب کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے ...... بے چین اور پریشان ہو جاتے ہیں ...... یہاں تک کہ ان کے اس اضطراب کو دیکھ کر دوسروں پر بھی اضطراب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

دلّی کے دوران قیام میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجاز لکھنؤ سے آئے تو میرے پاس ٹھہرے۔ ایک دن تو میرے یہاں رہے، پھر یہ کہہ کر جوش صاحب کے یہاں جا رہا ہوں، سامان چھوڑ کر اس طرح غائب ہوئے کہ کئی دن تک خبر ہی نہیں لی۔ میں چونکہ ان کے مزاج سے واقف ہوں، اس لئے مجھے ان کی اس حرکت میں کوئی تشویش اور فکر کا پہلو نظر نہیں آیا........جو بھی پوچھتا میں یہی کہہ دیتا کہ سامان تو ان کا یہاں پڑا ہے لیکن جوش صاحب کے یہاں چلے گئے ہیں۔ وہاں مفت کی پیتے ہوں گے ......اس سہارے سے ان کا جی لگ گیا ہوگا...... مجاز کو گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔میری طبیعت اس دن کچھ خراب تھی۔اس لئے چاروں طرف سے دروازے بند کر کے بستر میں لیٹ گیا تھا۔ویسے میں دن کو بالکل نہیں لیٹتا لیکن اس دن بیٹھے رہنے اور کام کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دن کے کوئی تین بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا کوئی طالب علم ہوگا۔ایک دو بار کھٹکھٹا کر چلا جائے گا۔لیکن دستک برابر ہوتی رہی۔ مستقل اور مسلسل ......تب مجھے یہ خیال ہوا کہ ضرور کوئی صاحب کسی اہم کام سے آئے ہیں اس لئے دروازہ کھول دینا چاہیئے۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا جوش صاحب تھے۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ان پر ایک عجیب گھبراہٹ کا عالم تھا........ مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا:

''مجاز مر گیا۔''

یہ سن کر تو میرے بھی پیروں تلے سے زمین نکل گئی بلکہ گھگھی بندھ گئی........ میری چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ عرشؔ اور آزادؔ نے تفصیل سنانی شروع کی........نہ جانے کس نے ابھی ابھی جوش صاحب کو ٹیلی فون پر یہ خبر دی ہے........خبر غلط بھی ہو سکتی ہے خدا کرے غلط ہو !....خیر، میں نے جوش صاحب کی حالت غیر دیکھ کر انہیں پہلے تو ایک کرسی پر بٹھایا اور عرش سے مخاطب ہو کر کہا کہ یقیناً یہ خبر غلط ہے، صرف اس خیال سے کہ جوش صاحب کی پریشانی دور ہو......پھر انہیں کچھ اس طرح سمجھانا شروع کیا کہ کہیں شراب زیادہ پی لی ہوگی، بے ہوش ہو گیا۔لوگوں نے سوچا ہوگا آپ کو

اطلاع دے دی جائے.......آپ تو مجاز کو جانتے ہی ہیں۔ باتیں تو میں اس قسم کی کر رہا تھا لیکن دل سے خدا ہی کو خبر تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا......خیر یہ باتیں سن کر جوش صاحب کو کسی قدر اطمنان ہوا ......ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ پھر میں نے کچھ طالب علموں کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کی کہ کسی نہ کسی طرح مجاز کی خیر خبر معلوم کر کے مجھ تک پہنچائیں۔ شام ہونے لگی تھی، اس لئے جوش صاحب سے میں نے کہا کہ آپ گھر جا کر آرام کیجئے۔ مجاز پہنچ جائے گا......یہ باتیں سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ورنہ اس سے قبل تو ان پر ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا.....

جوش صاحب تو میرے کہنے پر گھر چلے گئے اور طالب علموں نے مجاز کو تلاش کرنا شروع کیا رات گئے یہ خبر ملی کہ ایک جگہ اس نے بہت شراب پی لی تھی اور دو دن سے وہیں پڑا ہوا ہے۔ میں نے رات ہی کو جوش صاحب کو یہ خوش خبری بھیجی۔ جس وقت میرا خط پہنچا اسی وقت بعض لوگوں نے مجاز کو بھی جوش صاحب کے یہاں پہنچا دیا۔ دوسرے دن جوش صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا:

''حضرت، خوش خبری کا شکریہ قبول فرمائیے۔''

صبح جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مردود مجاز آزاد کے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے بہت ڈانٹا پھٹکارا۔ اور اسے ہدایت کے ساتھ اپنے گھر روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر وہ غسل کرے اور کھانا کھائے۔

معلوم نہیں کس ابنِ زیاد نے اس کی موت کا فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیکی کی توفیق دے۔ میں اس کے اس قاتلانہ فعل کو معاف کرتا ہوں۔ ہلاک کر دیا مجھے اس بد بخت کے فون نے۔

نیاز مند جوشؔ

اس واقعے سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب دوستوں سے کس بلا کی محبت کرتے ہیں۔

جوش صاحب کو احباب سے ملنے میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے ان کے بہترین لمحے وہی ہوتے ہیں جب وہ احباب کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں۔ اسی لئے ہر صحبت کی یاد ان کے دل میں ایک داغ بن جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک خاص حصہ اسی قسم کے جذبات کی

ترجمانی پر مشتمل ہے۔ خطوں میں بھی اکثر اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں:

''اکثر آپ یاد آتے ہیں۔ اب تو یادوں کا موسم ہے۔ مستقبل سے کوئی توقع نہیں۔ حال، زباں حال ہے اس لئے جو کچھ ہے وہ ماضی ہے برسی ہوئی گھٹائیں کیونکر گرجتی برستی ہیں۔ یہ مجھ سے پوچھئے اور بھولی بسری صحبتیں کیونکر گونجتی ہیں، یہ بس میرا ہی دل جانتا ہے کبھی کبھی یاد کرتے رہیئے۔ عمر کا پیمانہ چھلکا ہی چاہتا ہے،۔

بیار بادہ کہ مینائے عمر بریز است
مریض رادم آخر چہ جائے پرہیز است

نیاز شعار

وہی جوش بادہ گسار''

شاید ہی کوئی خط ایسا ہوتا ہو جس میں جوش صاحب احباب کو اس قسم کی باتیں نہ لکھتے ہوں۔ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہو جب جوش صاحب اس طرح کی باتیں کرتے نہ ہوں ان پر احباب کے بچھڑنے کا خیال، بچھڑنے سے پہلے ہی طاری ہو جاتا ہے ....اور اس میں ان کے حد درجہ حساس اور جذباتی ہونے کو دخل ہے.......لیکن اس میں کتنی انسانیت ہے۔

اسی کا یہ اثر ہے کہ جوش صاحب احباب کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دوست پر کوئی وقت آن پڑے جوش صاحب اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ دوست کو کسی مدد کی ضرورت ہو، جوش صاحب اس کے لئے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ دوستوں کے لئے یا دوستوں کا واسطہ اور حوالہ دے کر ان سے سب کچھ کرایا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ایسا موقع آ پڑے تو ان میں ایک نئی زندگی بیدار ہو جاتی ہے تساہل کو وہ بالائے طاق رکھ کر میدان میں کود پڑتے ہیں اور میدان سر کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

چند سال ہوئے مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری کو حکومت بمبئی نے اشتعال انگیز تقریریں کرنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیا تھا۔ کئی مہینے انہیں جیل میں گزارنے پڑے۔ جوش صاحب کو بھی بعض احباب نے یہ خبر پہنچائی.........کہنے لگے.....''اچھا تو اب ادیب اور شاعر بھی گرفتار کئے

جانے لگے .... یہ کیا اندھیر ہے ...... کیا مجھے اس سلسلے میں پنڈت جی (پنڈت جواہر لال نہرو) سے ملنا چاہیئے؟ ...... احباب نے شہہ دی اور کہا...... "اس سے زیادہ اہم معاملہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ضرور ملنے کی ضرورت ہے'......... بس جوش صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے ...... اور کہنے لگے .... کیوں صاحب! اب یہ نوبت آگئی کہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کر کے قید کیا جانے لگا .... یہ کیسی اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ کیا آپ کی حکومت میں یہ بھی ہوگا؟ کیا آزادی اسی لئے ملی ہے؟ ...... غرض اس طرح کی بہت سی باتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال ان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں سن سن کر مسکراتے رہے اور یہی کہا کہ جوش صاحب ! آپ اطمینان رکھیئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا فکر نہ کیجئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سردار جعفری کو چھوڑ دیا گیا۔

احباب جوش صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہیں۔ احباب کے لئے تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلوان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے۔

جوش صاحب محبت کے بندے ہیں وہ انسان ہیں .... صحیح معنوں میں انسان ہیں .... انسانیت کا خیال اور احساس ان کی شخصیت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں، جو کچھ بھی سوچتے ہیں، جو کچھ ان کا مطمح نظر ہوتا ہے سب کی محرک ان کی یہی انسانیت اور انسان دوستی ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے اسی انسانیت کے گیت گائے ہیں۔ یہی ان کا فلسفہ ہے۔ یہی ان کا مذہب ہے۔ یہی ان کا نصب العین اور نظریۂ حیات ہے۔ یہی محور ہے جس کے گرد، ان کی زندگی کا چاک گھوم رہا ہے۔ اسی لئے ان کی انسانیت اور انسان دوستی کے مفہوم میں ایک وسعت ہے۔ ایک گہرائی ہے ایک گیرائی ہے۔ ایک تنوع ہے۔ ایک رنگا رنگی ہے ...... حیات و کائنات کے تمام پہلوؤں کا اس نے احاطہ کرلیا ہے وہ ساری انسانی زندگی پر حاوی ہے انسانیت ان کے نزدیک زندگی ہے اور زندگی انسانیت !

شاعر انقلاب نے ریاست کی فضا اور امارت کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ساری زندگی امیروں اور رئیسوں کی طرح رہے اس لئے آرام اور راحت کا خیال گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ لذت پرستی اور تعیش پسندی انہیں ورثے میں ملی ہے ایسا کرنے کے لئے وہ بڑا اہتمام کرتے ہیں اور

بعض اوقات تو اس سلسلے میں اپنے حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بے راہروی ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتی جو پرانے امراء اور رؤسا کا شیوہ تھی۔ جوش صاحب کام کرتے ہیں۔محنت اور جفا کشی سے گھبراتے نہیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو اُن کے مزاج کے خلاف اور طبیعت کے منافی ہو۔ وہ ایک تعلقہ دار خاندان کے چشم و چراغ ہیں لیکن ان کی زندگی میں کوئی ایسی بے راہ روی نہیں جو انہیں ذہنی یا جذباتی اعتبار سے ابنارمل ثابت کرے۔ وہ ذہنی اور ذاتی اعتبار سے ایک عام انسان کی طرح صحت مند ہیں۔لذت اور تعیش ان کے مزاج میں ضرور ہے لیکن اس معاملے میں بھی وہ انتہا پسند نہیں ہیں......اور انتہا پسند نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں لذت اور تعیش کا خیال ہمیشہ اپنے حدود میں رہتا ہے........ان کی لذت پرستی اور تعیش پسندی ہی ہے کہ وہ عورت اور شراب کے شیدائی ہیں........عورت ان کے نزدیک ایک سحر ہے اور اس سحر کے بغیر زندگی میں رس اور رعنائی کا وجود نہیں ہوتا.....زندگی عورت کے بغیر بے کیف ہے، بے رنگ و بو ہے......اس کی تکمیل عورت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔اسی خیال نے انھیں صنفِ لطیف کا پجاری بنایا ہے،ان سے اپنے حسن کی پرستش کرائی ہے......وہ اس کی ہستی میں کھو گئے ہیں۔اسی کی رعنائیوں میں اپنے آپ کو غرق کر دیا ہے۔اسی خیال نے ان سے سترہ عشق کرائے ہیں......ایک انسان ایک زندگی میں سترہ عشق کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟.......یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال ہے لیکن جوش صاحب نے سترہ عشق کئے ہیں (اور اب جب کے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں ان کی تعداد نہ جانے کہاں تک پہنچ گئی ہوگی۔) سترھواں عشق تو وہ تھا جو انھوں نے بمبئ میں چوپاٹی کے ساحل پہ کیا تھا.........اور ان کی مشہور نظم ''تو اگر واپس نہ آتی'' جس کی یادگار ہے اور جو یوں شروع ہوتی ہے ؎

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

زندگی کے مختلف زمانوں میں ان کے عشق کے میدان مختلف رہے ہیں۔ کسی خاص عورت سے جذباتی قرب کو وہ عشق سمجھ لیتے ہیں۔ اگر یہی عشق ہے تو انسان ایک زندگی میں سیکڑوں عشق کر سکتا ہے۔ جوش صاحب کے عشق میں اسی وجہ سے عظمت نہیں ہے کیونکہ وہ میرؔ کی سپردگی کو عشق نہیں سمجھتے۔ وہ تو غالب کی طرح پرستش کے بجائے خواہش کو عشق کا نام دیتے ہیں........اسی لئے جوش

صاحب نے عشق و مشق نہیں کیا ہے۔ وہ لذت کی شمع کے پروانے ہیں لیکن ان کی یہ لذت جذباتی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اسی کو وہ عشق کا نام دے دیتے ہیں۔ عشق اس طرح نہیں ہوتا۔ جوش صاحب خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں .... اسی لئے عشق سے ان کو مطلب نہیں ہوتا، محض جذباتی تقاضوں کی تکمیل مراد ہوتی ہے ..... اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے صنفِ لطیف سے اکتسابِ لذت کا یہ خیال جوش صاحب کے یہاں ایک فطری آہنگ کے ساتھ ابھرتا ہے .... اور ان کی ساری شخصیت پر چھا جاتا ہے۔ جوش صاحب صنفِ لطیف کو اسی لئے صانع ازل کی نازک ترین صنعت سمجھتے ہیں۔ اس کا وجود انھیں شمعِ بزمِ عالم نظر آتا ہے۔ جس کی نازک ہستی کی تکمیل و تعمیر میں قدرت کی انتہائی تخیل دلربائی کام آئی ہے .... اسی لئے تو وہ اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس دلچسپی لینے کو انسانی زندگی کی صحت مندی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنفِ لطیف سے یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی ان کی شخصیت میں اس قدر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ اسی کو زندگی سمجھتے ہیں .... میرا مطلب ہے زندگی کا ایک اہم پہلو ....،

جوش صاحب کی شخصیت میں اس عورت کی حکمرانی ہے اسی لئے تو بعضوں نے انھیں شاعرِ انقلاب کے بجائے شاعرِ شباب کہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ شاعرِ شباب ہیں بھی۔ یہ خطاب انھیں زیب دیتا ہے۔ انھوں نے شباب کے گیت گائے ہیں۔ جوانی کے راگ سنائے ہیں ...... وہ جوانی جو پہلو میں آگ سی لگاتی ہے اور سینے میں دھوم مچا دیتی ہے ...... اور جس کے نتیجے میں حسن و عشق کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ دلوں کی بازی لگائی جاتی ہے۔ جوش صاحب خود ان منزلوں سے گزرے ہیں، ان کی جوانی خاصی دیوانی رہی ہے ..... اور جوانی کا دیوانہ ہونا، انسانیت سے الگ نہیں ہے۔ وہ تو انسانی زندگی کا اہم پہلو ہے۔ جوش صاحب کی جوانی میں دیوانی ہو جانے والی کیفیت اسی لئے تو اپنے آپ کو اس قدر نمایاں کرتی ہے ....،

اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جوش صاحب کی شخصیت میں صرف صنفِ لطیف ہی سے اکتسابِ لذت کا خیال نہیں ملتا وہ مناظرِ فطرت سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں، انسانی زندگی کے عام حالات ان کے لئے لذت کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے نزدیک صبح کے منظر میں بھی ایک لذت ہے،

دوپہر کی دھوپ میں بھی ایک لذت ہے، چاندنی کی مسکراہٹ میں بھی ایک لذت ہے، رات کی تاریکی میں بھی ایک لذت ہے، ساون کی پھواروں میں بھی ایک لذت ہے، پرواہوا کے چلنے میں بھی ایک لذت ہے، چاند کے طلوع ہونے اور آفتاب کے غروب ہونے میں بھی ایک لذت ہے۔غرض زندگی میں ہر طرف لذت ہی لذت ہے۔ کیونکہ حسن دنیا کے چپے چپے پر بکھرا پڑا ہے اور حسن کے بغیر لذت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔لیکن اس حسن سے لذت اندوز ہونے کے لئے ایک نگاہِ شباب کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس حسنِ دلفریب پہ یوں دھن رہا ہے سر
تیری ہی بے خبر وہ نگاہِ شباب ہے !!!

اور یہ نگاہِ شباب جوش صاحب کے یہاں زیادہ نمایاں ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ یہی ان کی شخصیت ہے اور اس نے ساری انسانی زندگی کو ان کی نظروں میں حسین بنا دیا ہے۔ ایک ایک چیز کو حسن سے معمور کر دیا ہے۔ بے جان چیزوں میں، جاندار چیزوں میں، غرض ہر چیز میں ان کی نگاہیں حسن دیکھتی ہیں۔انہیں اپنے چاروں طرف حسن ہی حُسن نظر آتا ہے۔ایسی چیزوں میں بھی وہ حسن کے پہلو نکال لیتے ہیں جو بظاہر حسین نہیں ہوتیں۔ایسا نہ ہوتا تو کوہستان دکن کی عورتوں میں وہ حسن نہ دیکھ پاتے جو بظاہر سنگِ اسود کی چٹانیں ہوتی ہیں لیکن جن کا وجود کیا خبر کتنے دلوں کو پامال کرتا ہے۔گاتی ہوئی پگڈنڈیوں اور کھیتوں کے درمیان ترشی ہوئی راہوں میں وہ حسن نہ دیکھ پاتے۔گرمیوں کی دوپہر اور دیہات کے بازاروں میں انہیں حسن نظر نہ آتا......لیکن انہوں نے اس نوعیت کے ان گنت پہلوؤں میں حسن دیکھا ہے......اور اس سے متاثر ہوئے ہیں......'

جوش صاحب کو عام انسانوں سے گہری دلچسپی ہے۔وہ ان کے معاملات سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ان کی شخصیت میں محبت کا خیال جو ایسی رچی ہوئی صورت میں نظر آتا ہے، اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے۔وہ خیر ہی خیر ہیں۔شر کا خیال بھی ان کی شخصیت میں نہیں ملتا۔دشمن کے ساتھ بھی وہ نیکی کرتے ہیں۔مفسد کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے ہیں۔مخالف کے ساتھ بھی ہمدردی کرتے ہیں۔اسی لئے عفوو درگزر کا پہلو، ان کی زندگی میں بہت نمایاں ہے۔کوئی انہیں بڑی سے بڑی تکلیف پہنچائے، وہ اُسے معاف کر دیں گے انتقام کا تو کبھی

خیال بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا ...... کسی انسان کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لئے دوسروں کا دکھ ان کا اپنا دکھ بن جاتا ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو وہ اپنی تکلیف بنا لیتے ہیں۔

یہی کیفیت ان کے تصورِ انقلاب کا منبع ہے۔ وہ انقلابی ہیں۔ انہوں نے انقلابی شاعری کی ہے اور صرف اس لئے کی ہے کہ اس کے بغیر انہوں نے انسانوں کو تکلیف میں دیکھا ہے، پریشانی میں گرفتار پایا ہے۔ انسان پر انسان کی بیداد ان کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، جبر و استبداد کا عفریت انہیں ڈستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس نظام میں جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ جس میں انسانوں کے لئے زندگی کی آسائشیں نہیں ہیں۔ راحت و آرام نہیں ہے جن کی زندگی محض آلام سے عبارت ہے شاعر انقلاب اس نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ اس عالم میں وہ خونریزی سے بھی گریز نہیں کرتے ..... خون کی ندیاں بہاتے ہیں اور ان کا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب ہو جاتا ہے .... اس انقلاب میں ان کی نظریں زوال جہانبانی دیکھتی ہیں اور ایک نیا نظام انہیں قائم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں امن اور عافیت کا ہونا یقینی ہے جس میں امیر و غریب، آقا اور مزدور کی تفریق کا مٹ جانا لازمی ہے۔ بس یہی جوش صاحب کا انقلاب ہے۔ ان کے انقلاب میں جھنجھلاہٹ زیادہ ہے۔ ایک اُبال کی سی کیفیت زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے انقلاب کو ایک ہنگامہ بنا دیا ہے۔ عمرانیات کے مفکروں نے انقلابات کے جو تصورات پیش کئے ہیں ان سے شاعر انقلاب کو غرض نہیں۔ وہ تو انقلاب چاہتے ہیں لیکن اس انقلاب میں کسی منصوبہ بندی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ طبیعت کا اضطراب انہیں اتنی فرصت ہی کہاں دیتا ہے؟ مزاج کی بے چینی اتنی مہلت ہی کب دیتی ہے۔ وہ انقلاب کے معاملات پر غور کم کرتے ہیں۔ اس پر عمل زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں انقلاب کا تصور اگرچہ تمام رومانی اور تخیلی ہے لیکن اس کے باوجود وہ تمام تر انسانی محبت اور ہمدردی سے معمور ہے۔

شاعر انقلاب کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر کبھی کسی سیاسی بات کا خیال انہیں آتا بھی ہے تو صرف عام انسانوں کی بہتری کے خیال سے آتا ہے اگر کبھی وہ سیاسی معاملے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے پیش نظر نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ جو سیاست عوام سے دور ہو اس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ گزشتہ نصف صدی کی ملکی سیاست میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے۔

وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کی ہے اوراس طرح قومی تحریکوں میں شریک ہوئے ہیں۔انگریز نے ان کے ہم وطنوں پر کئی سو سال تک ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اوراس طرح انہیں آزادی اور فارغ البالی کی مسرتوں سے محروم رکھا۔اسی لئے وہ انگریز کے مخالف رہے ہیں۔ جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی ہے تو یہ مخالفت بہت واضح ہوکر سامنے آئی ہے۔''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ وطن پرستی اورعوام دوستی کے زیراثر کہا ہے۔پھر جب حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں تو انہوں نے ملک میں اشتراکی سیاست کی ہمنوائی بھی صرف اسی خیال سے کی ہے کہ شاید یہ عوام کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔بہرحال ان کی سیاست عام انسانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے۔تقسیم ہند کے بعد جس افراتفری اور انتشار کا دور دورہ ہوا،اوراس کے نتیجہ میں جس طرح ہنگامہ آرائی ہوئی،اس پر اظہارخیال کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں،

''کہہ نہیں سکتا عبادت صاحب کہ اس تقسیم اعضاء وجوارح کا میرے دل پر کس قدر اثر ہے۔حیات کے تمام ولولے ٹھٹھر کر رہ گئے۔ ہندوستان کیا بٹا کہ سب کچھ لُٹ گیا ....اے سیاست ، تجھ پر لعنتوں کی بارش اور پھٹکاروں کی بوچھار........''

جینے سے میں سیر ہو چکا ہوں۔جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر تھک کر چور ہو چکا ہوں کہ اب زندگی کا چلانا خبیث ترین قید بامشقت معلوم ہورہا ہے.......'

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو فریبِ عیش دیتے دیتے
اُف جہدِ حیات تھک چکا ہوں معبود!
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے ''

نیازمند

جوشؔ

یہ سطریں شاعرِ انقلاب سے اسی انسانی احساس نے لکھوائی ہیں۔جسے وہ کسی حال میں بھی

اپنے آپ سے جدا نہیں کرتے۔ اسی انسانی احساس نے انہیں سیاست کو جذبات کی عینک سے دیکھنا سکھایا ہے۔ سیاست انسانی جذبات پر بُرا اثر کرے تو وہ اس کو ایک لعنت اور پھٹکار سمجھتے ہیں، موجودہ دور کی سیاست اسی انسانی احساس سے محروم ہے اسی لئے میں نے جوش صاحب کو کبھی بھی سیاست کی باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا، البتہ سیاست جس طرح انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے بارے میں اکثر گفتگو کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں سیاست کے غیر انسانی ہونے کا بڑا دکھ ہے اور وہ ایک کرب کے عالم میں اس پر اظہار خیال کر دیتے ہیں۔ یہ کرب کا عالم میں نے اکثر ان پر دیکھا ہے۔

جوش صاحب مذہب سے برگشتہ ہیں۔ ان پر کسی مذہب کا اثر نہیں ہے۔ ایک زمانے میں سنا ہے، ان پر تصوّف کا کچھ اثر ہو گیا تھا اور تقریباً انہوں نے فقیری لے لی تھی، گیرۂ ے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ ڈاڑھی بڑھائی تھی۔ سر پر کاکلیں رکھ لی تھیں..... ویسے میں نے اس عالم میں انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ بعض اشعار سے یہ خیال ضرور ہوتا تھا کہ تصوّف کا ان پر اثر رہا ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر تو پوری طرح تصوّف کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

عرفاں کا ذوق لے لے اے زندگی خدارا
دریائے معرفت کا ملتا نہیں کنارا

ایک دن میں نے جوش صاحب کے سامنے یہ شعر پڑھا اور کہا کہ ” آپ تو مذہب اور روحانیت کے قائل نہیں پھر یہ تصوّف کا شعر آپ نے کیسے کہہ دیا ؟......“

کہنے لگے :

”عبادت صاحب ! یہ تصوّف کا شعر نہیں ہے۔ آپ نے اسے تصوّف کا شعر کیسے سمجھ لیا۔“

میں نے کہا:

”اس میں تو کھلم کھلا عرفان اور معرفت کا ذکر ہے اور عرفان و معرفت کا مطلب ہماری ادبی روایت میں معرفتِ الٰہی ہے۔“

انہوں نے جواب دیا :

''شاید آپ کو عرفان کے لفظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔عرفان سے مراد عرفانِ زندگی ہے۔''

میں نے کہا :

''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

کہنے لگے :

''انسانی زندگی میں عرفانِ حیات کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں
ابھی تو انسان نے گھٹنوں چلنا سیکھا ہے۔ابھی تو انسان نے عرفانِ حیات کی
اوّلین منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں......ابھی تو اس راہ پر اسے نہ جانے کتنا
آگے جانا ہے۔سائنس اور فلسفے کے نہ جانے کتنے انکشافات ابھی کلی سے
پھول بننے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی باتوں کے بجائے حیات انسانی کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔عرش سے زیادہ فرش ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔..........

وہ مذہبی معاملات کو اہمیت نہیں دیتے لیکن مذہبیات سے انہیں دلچسپی ضرور ہے۔انہوں نے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔وہ مذہب کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی سے گفتگو کرتے ہیں۔اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ....اور ان کی باتوں میں خاصی گہرائی ہوتی ہے۔خاصا نیا پن ہوتا ہے وہ خاصی دلچسپ ہوتی ہیں ....اس کو کیا کیا جائے کہ انہیں تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا..........

جوش صاحب ویسے اب کسی مذہب کو نہیں مانتے لیکن اسلام کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی پسند مذہب سمجھتے ہیں۔ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے:

''اگر میں کسی مذہب کا قائل ہوتا تو وہ اسلام ہے۔زندگی کے بارے میں
اس سے زیادہ ترقی پسندانہ زاویہ نظر کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔''

اس پر میں نے کہا :

''ترقی پسند زاویہ نظر سے آپ کا کیا مطلب ہے......''

انہوں نے جواب دیا :

''اس میں انسانیت کا خیال سب سے زیادہ ہے۔''

میں نے کہا :

''انسانیت کا خیال تو ویسے تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔''

کہنے لگے :

''اسلام میں اس خیال کی بنیاد روشن خیالی پر استوار ہے اور یہ
اس کا ترقی پسندانہ پہلو ہے۔''

لیکن اسلام کے اصول پر وہ عقیدہ نہیں رکھتے.........ایک صاحب نے بڑی مزے کی بات کہی کہ اب وہ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے، لیکن حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؑ پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ خدا اور رسول کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؑ کا ذکر برابر کرتے ہیں اور اس ذکر میں خاصی عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بچپن میں اپنی دادی کے اثر سے ان پر شیعہ عقائد کا رنگ چڑھ گیا تھا، اور وہ اب تک اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

اس عالم میں بھی جب وہ کسی مذہب کو بھی نہیں مانتے......جوش صاحب نے خود اس سلسلے میں ایک دفعہ بڑی مزے دار بات کہی تھی کہ

''بھئی میری حالت تو.........مرض کی حیثیت رکھتی ہے اور آپ
جانتے ہیں۔ یہ مرض کبھی جاتا نہیں.....''

جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں جوش صاحب کسی مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک متشکک انہیں کہا جا سکتا ہے ....اس سے ہٹ کر ہماری زندگی میں دیکھئے تو وہ انسانیت کو مذہب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اگر انسانیت کا تصور پیش نظر ہو تو پھر کسی مذہبی اصول کی ضرورت نہیں !..........ایسی صورت میں نظامِ حیات (اُن کے خیال کے مطابق) انسان مذہب اور اس کے اصولوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ویسے یہ ہے تو بڑا اختلافی مسئلہ لیکن اس سے جوش صاحب کی انسانیت انسان دوستی اور

انسانیت پرستی پر حرف نہیں آتا۔ان خیالات سے تو اس کو تقویت پہنچتی ہے۔

جوش صاحب شاعر ہیں فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کے یہاں ایک فلسفہ حیات ملتا ضرور ہے انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے اور اس غور و فکر کے بعد چند نتائج نکالے ہیں۔وہ مابعد اطبیعاتی معاملات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔زندگی میں مادہ ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس مادی زندگی میں خیر و شر کے درمیان ایک آویزش اور کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی کشمکش اور آویزش کے نتیجے میں انسانی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ارتقائی راہوں پر گامزن ہوتی ہے۔یہی جہدِ ارتقا ہے۔یہی جدلیات کا نظریہ ہے۔تہذیبی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی غرض تمام مسائل کو وہ فلسفیانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں لیکن آخر میں ان کے یہاں بہر حال شاعر فلسفی پر غالب آجاتا ہے اور وہ فلسفی کے بجائے شاعر ہی رہ جاتے ہیں۔ایسا نہ ہوتا تو وہ جدلیات پر ایمان رکھنے کے باوجود جبر کے قائل نہ ہوتے۔انسانی زندگی انہیں بے بسی کا شکار نظر نہ آتی۔اصل سبب اس کا یہ ہے کہ جذبات کا پہلوان کی شخصیت میں اس قدر شدید ہے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جبر کے اس حد تک قائل ہیں کہ بعض اوقات تو ان کی باتیں سُن کر شوپنہار اور ہارڈی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ایک شام جوش صاحب شراب پی رہے تھے کہ بات جبر و اختیار کے فلسفیانہ مسائل پر چھڑ گئی۔

میں نے کہا :

''آپ یہ شراب اپنے اختیار ہی سے تو پی رہے ہیں۔''

کہنے لگے :

''مجھے اس پر بالکل اختیار نہیں!''

میں نے کہا :

''یہ کس طرح؟''

کہنے لگے :

''کوئی طاقت مجھ سے کہتی ہے کہ اس گلاس میں شراب انڈیل دو۔
میں انڈیل دیتا ہوں۔پھر کوئی طاقت کہتی ہے ہاتھ بڑھاؤ میں ہاتھ بڑھا

دیتا ہوں ۔ پھر وہ طاقت کہتی ہے شراب پیو کہ اس سے تمہیں زندگی کی لذت حاصل ہوگی، سرور ملے گا، جہاں کا غم غلط ہو جائے گا۔ بس میں شراب پی لیتا ہوں ۔ اس میں میری ذات کو تو ذرا بھی دخل نہیں ۔''

میں نے کہا :

''جوش صاحب ! یہ بڑی شاعرانہ بات ہے لیکن اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔''

اس پر انہوں نے جواب دیا :

''عبادت صاحب ! زندگی میں بس یہی ایک حقیقت ہے ۔ انسان بے بس ہے اس کے اختیار میں کچھ نہیں .... کچھ بھی تو نہیں ۔''

اور پھر انہوں نے انسانی زندگی کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں شروع کر دیں ۔ کہ قدم قدم پر اس زندگی میں انسان کو بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ بچپن جوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ جوانی بڑھاپے میں بدل جاتی ہے اور پھر موت کا خطرہ ہر ہر گام پر درپیش ہوتا ہے ۔ چنانچہ موت آتی ہے ۔ پھولوں سے شگفتہ چہرے کملا جاتے ہیں ۔ کیسی کیسی صورتیں خاک میں پنہاں ہو جاتی ہیں اور انسان کا کچھ بھی بس نہیں چلتا .... مشیت کا یہ منشا ہے کہ ہر شخص کی خواہش اس کے دل میں ایک داغ بن جائے ۔ میں نے چند اشعار میں اس خیال کو واضح کیا ہے ۔ سنیئے عبادت صاحب ! غور سے سنیئے .... ہائے ۔

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ قلبِ آدم خاکی سدا فگار ہے
بس ایک بار میّسر ہوں حسن کی باہیں
تمام عمر کو حسرت گلے کا ہار رہے
ہر ایک بوسۂ شیریں کا مدعا یہ ہے
کہ داغ بن کے کلیجے میں یادگار رہے

صاحب ! یہی انسانی زندگی ہے انسان کی ساری زندگی ہائے ہائے کرتے گزرتی ہے اور پھر جب مرتا ہے تو منہ بنوا ہو جاتا ہے، بنوا .... اور پھر یہیں پر بس نہیں ۔ مرنے کے بعد بھی کیا چین

ملتا ہے۔ سرِ حشر بھی حساب لیا جائے گا۔ ایک رباعی یاد آ گئی سنیئے ؎

معبود، حیات تھی سو مرتے گزری
اک عمر کے دغدغوں سے ڈرتے گزری
اس عمر کا بھی حساب لے گا سرِ حشر
جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

مشیت کی یہ خواہش ہے کہ جو شخص بھی مرے اس کا منہ بنا ہو جائے۔ پچک جائے، سوکھ جائے۔ دیکھنے کے قابل نہ رہے..........

اس کے بعد تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر کہنے لگے :

"آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے عبادت صاحب !
کہ انسان کو کتنی مختصر سی زندگی ملتی ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں وہ کیا کیا کچھ کرتا ہے زمین سے سونا اگلواتا ہے، سمندروں کے سینوں پر دوڑتا ہے۔ آسمانوں پر پرواز کرتا ہے۔ ساری انسانی زندگی انسان کی عظمت کا ایک نغمہ ہے، ایک راگ ہے ایک الاپ ہے، لیکن مشیت اس کا صلہ انسان کو یہ دیتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ جب انسان کام کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اسے کام کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے......قدغن لگا دی جاتی ہے کہ اب کام نہیں کر سکتے۔ اب تم بیکار ہو۔ اب تمہارے تجربے کی زندگی کو ضرورت نہیں ہے۔ انسان جب ذہنی فکری اور عملی اعتبار سے بلوغ کو پہنچتا ہے تو اسے اٹھا لیا جاتا ہے۔ موت آ جاتی ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ یہ کون سا قانون ہے؟ خدارا مجھے بتایئے عبادت صاحب !"

اور میں نے ہمیشہ ان کی ایسی باتوں کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہی سے دیا ہے :

شاعرِ انقلاب نے مجھ سے اس طرح کی بے شمار باتیں کی ہیں۔ اتفاق اور اختلاف سے قطع نظر ان باتوں کو جوش صاحب کی زبانی سن کر مجھے ایسا لطف آیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتو ں کی بنیاد شدید انسانی احساس ہے۔ انہیں انسانی زندگی سے جو گہرا لگاؤ ہے جو

گہرا تعلق ہے وہ ان سے اس قسم کی باتیں کہلواتا ہے ....وہ انسانی زندگی اوراس کی مسرتوں کے شیدائی ہیں اور انہیں مسرّتوں کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔اس لئے جب یہ مسرّتیں انہیں آندھیوں کی زد پر نظر آتی ہیں۔تو اس قسم کے خیالات کا اظہار ان کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔پیمانہ لبریز ہو جائے تو شراب چھلک ہی پڑتی ہے۔'

لیکن زندگی کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے اوراس کے متعلق اس انداز میں سوچنے کے باوجود وہ ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں۔حیات انسانی نے ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں۔اس کا ذکر انہوں نے ہمیشہ بڑے فخر سے کیا ہے۔اسی ارتقا میں انہیں انسانی زندگی کی عظمت نظر آتی ہے۔نئے سے نئے فلسفیانہ نظریات نئے سے نئے عمرانی تصورات، نئے سے نئے سائنسی انکشافات پر وہ بڑی ہی پرلطف باتیں کرتے ہیں۔ان باتوں سے زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اوراس طرح اس کی صحیح اہمیت ذہن نشین ہوتی ہے۔

ایک دن میں نے دورانِ گفتگو میں بات پیدا کرنے کے لئے جوش صاحب سے کہا :

''آپ ارتقا کے قائل ہیں لیکن انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔کیا اس میں تضاد نہیں ہے؟''

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا......

''یہ تضاد تو خود زندگی میں موجود ہے۔''

میں نے کہا.......

''اس ارتقاء کے باوجود آج انسان موت کے سامنے بے بس ہے۔''

کیا آپ کے خیال میں کوئی زمانہ ایسا آسکتا ہے کہ وہ موت پر حاوی ہو جائے،اوراس پر قابو پالے۔''

کہنے لگے.........

''انسان کی ترقی کی رفتار سے یہ بعید نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہزار دو ہزار سال کے بعد یقیناً موت پر فتح پالے گا۔''

میں نے کہا........

''پھر تو لوگ مرنے کی آرزو میں مرا کریں گے جوش صاحب !''

کہنے لگے.......

''جو کچھ بھی ہو لیکن انسان کی مادی ترقی سے یہ بعید نہیں ہے۔ پہلے اس میں اس کو کامیاب ہو جانے دیجئے، پھر دیکھئے انسانی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ابھی سے آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟''

میں نے مرنے کی آرزو میں مرنے والی بات محض تفنن طبع کے طور پر کہی تھی۔ اس لئے ان کے جواب میں مجھے بڑا لطف آیا اور اس پر ہنسی آ گئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا جوش صاحب فلسفی نہیں ہیں۔ وہ صرف شاعر ہیں۔ اسی لئے ان کے فلسفیانہ خیالات و نظریات میں گہرائی نہیں ہے اور گہرائی نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس تضاد کے باوجود جوش صاحب نے حیات و کائنات کے بارے میں جو خیالات قائم کئے ہیں وہ غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان میں زندگی کے حقائق ہیں۔ جوش صاحب نے ان حقائق کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ ہر فلسفی کو انہوں نے پڑھا ہے اور بڑی محنت سے پڑھا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کی نہ جانے فلسفہ کی کتنی کتابیں تو ان کی فرمائش پر میں نے یونیورسٹی لائبریری سے نکال کر انہیں دی ہیں اور انہوں نے ان سب کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کیا ہے۔ تضاد پیدا ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر جذبات کے دھارے پر بہنے لگتے ہیں۔ شاعر ان پر غالب آ جاتا ہے اور ظاہر ہے وہ فلسفی سے کہیں زیادہ ایک شاعر ہیں۔

جہاں تک ان کے عمرانی نظریات کا تعلق ہے، ان میں بھی فلسفیانہ نظریات ہی کا سا انداز نظر آتا ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔ اشتراکیت ان کے خیال میں موجودہ زندگی کی کشمکش کا واحد حل ہے لیکن بعض باتیں ان کے یہاں ایسی بھی ملتی ہیں جن کا اشتراکیت سے کوئی سروکار نہیں۔ جہاں تک ان کا یہ خیال ہے کہ زندگی میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ انقلاب کے بعد ہی ایک ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے، جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو، ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم و ستم روا نہ رکھے۔ دولت کی تقسیم مساوی ہو۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کس طرح ہو گا۔ اس کا انہیں علم نہیں ہے۔ بات یہ ہے زندگی کی کشمکش کو وہ سامنے نہیں رکھتے، اسی لئے ان حالات کو سمجھنے سمجھانے میں ان کا انداز سائنٹیفک اور عقلی کم ہوتا ہے، جذباتی زیادہ!

اس صورت حال کا یہ اثر ہے کہ کبھی وہ اشتراکیوں کے خلاف ہو جاتے ہیں، کبھی موافق۔ کبھی ترقی پسندوں کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور کبھی ان کی جماعت انہیں مینڈکوں کا جلوس، نظر آتی ہے۔

اپنے ان خیالات میں جذباتی ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض معاملات میں تو ان کے خیالات کی حدیں رجعت پسندی سے جاملتی ہیں۔ مثال کے طور پر عورت کا تصور ان کے یہاں خاصا رجعت پسندانہ ہے وہ عورت کو محض تعیش اور لذت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور سماجی زندگی میں اسے کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، عورت کے لئے وہ تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے۔ علم و عمل کو وہ نسائیت کی موت خیال کرتے ہیں۔ اس موضوع پر میں نے ان سے بارہا بحث کی ہے۔ بحث سے تو وہ مجھے قائل نہیں کر پائے ہیں اور جب مجھے قائل ہوتا ہوا نہیں دیکھا ہے تو کہا ہے اچھا میرے چند اشعار سنیئے۔ آپ قائل ہو جائیں گے اور یہ کہہ کر مجھے یہ اشعار سنائے ہیں ؎

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے وہ بد دماغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
دور ہی سے ایسے علم جہل پرور کو سلام
حُسن ِ نسواں کو بنا دیتا ہے جو جاگیرِ عام
جس جگہ حورانِ جنت کا کیا ہے تذکرہ !
کیا کہا ہے اور بھی کچھ ہم نے جز حُسنِ حیا
تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال
ہم نے کیا ان کو کہا ہے صاحبِ فضل و کمال
ہیچ ہے ہر چیز، زیور، غازہ افشاں، رنگ و خال
حسن ہے ہر رنگ میں خود سو کمالوں کا کمال
چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب

کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب
میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار
''کاکلِ افسانہ'' ''ہودوشِ حقیقت'' سے دوچار
حسن کا آغوشِ رنگیں دلفریب و دل ربا
علم سے بن جائے اقلیدس کا محض اک دائرہ
مُصحفِ روئے کتابی، روکشِ نازِ گلاب
اور بن جائے لغت یا دفترِ علمِ حساب
نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات
بزم کاوش میں جلے شمع شبستانِ حیات

اور واقعی ان اشعار کو سننے کے بعد میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا ہوں۔ گویا کہ انہوں نے مجھے قائل کر دیا ہے۔ حالانکہ میں قائل نہیں ہوا۔ کون ہے جو ان اشعار کو سن کر جھومنے نہیں لگے گا؟

جوش صاحب کے نظریات سے کسی کو اختلاف ہو لیکن اپنی شاعری کے سحر سے وہ اختلافی مسائل کو بھی وقتی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ عورت کے بارے میں ان کے یہ نظریات قدامت پرستی اور رجعت پسندی پر مبنی ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں!

ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ جوش صاحب نے ایک زمانے تک قدامت کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ان پر باوجود بعض معاملات میں انقلابی ہونے کے اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات کا گہرا اثر ہے اور ان روایات کی پاسداری کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔

روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ شاعر انقلاب کو اپنی آبائی امارت اور ریاست پر بھی فخر ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ امارت کی مذمومات ان کی شخصیت میں نسبتاً بہت کم ہیں لیکن امارت کا خیال بہر حال موجود ہے۔ اس لئے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ ہر وقت گرد و پیش ایک درباری سا ماحول قائم رکھتے ہیں۔ اس ماحول میں درباداری کی فضا تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ جوش صاحب کی

شخصیت میں حد درجہ عجز و انکسار ہے لیکن ساتھ ہی ایک ایسا انداز بھی ہے جس میں درباری ماحول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جوش صاحب تنہا نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کے آس پاس کچھ لوگوں کا جمگھٹ ضروری ہے، ان لوگوں سے وہ خوش گپیاں کرتے ہیں۔ لطیفے سناتے اور سنتے ہیں۔ شعر و شاعری ہوتی ہے۔ اور اس طرح ان کا وقت گزرتا ہے۔ اس محفل میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے لیکن اس میں شریک ہونے کے لئے آدابِ محفل کا خیال ضروری ہے۔ جوش صاحب اپنی محفلوں میں ایسی حرکات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو معاشرتی اور تہذیبی روایات کے خلاف ہوں۔ اسی لئے ان محفلوں میں بے تکلف ہونے کے باوجود وہ ایک مخصوص دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ چند حدود بہر حال قائم رکھتے ہیں۔

جوش صاحب کو پوری طرح بے تکلف تو ان کے چند مخصوص احباب ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان احباب سے وہ محبت کرتے ہیں۔ ان احباب پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے سامنے وہ کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے، انہیں کے ساتھ ان کے وقت کا بیشتر حِصہ گزرتا ہے۔ وہ ان سے بے تکلف ہوتے ہیں اور اس بے تکلفی میں پرانے واقعات کو دہرایا جاتا ہے۔ حسن و عشق کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، لطیفوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نوبت رقص و سرود اور مناقشے تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ محفلیں صرف بذلہ سنجیوں کیلئے مخصوص ہوتی ہیں۔ سنجیدہ گفتگو ان میں نام کو بھی نہیں ہوتی ۔ جوش صاحب ان احباب کی خاطر کرتے ہیں۔ انہیں کھلاتے ہیں، پلاتے ہیں۔ ان کے لئے دلچسپیوں کے مختلف سامان فراہم کرتے ہیں اور اس طرح ان کی یہ محفلیں کافی پُرلطف بن جاتی ہیں۔

یوں احباب کے معاملے میں جوش صاحب زود رنج نہیں ہیں۔ شاید ہی وہ اپنے کسی دوست سے کسی بات پر ناراض ہوتے ہوں۔ البتہ کبھی کبھی نشے میں ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس عالم میں جب کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو، اور جس کے واقع ہونے سے انہیں یہ خیال گزرے کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا ہے۔ کئی سال کی بات ہے۔ ایک بے تکلف دوست دلی آئے جوش صاحب نے مجھے اور انہیں شام کے کھانے پر بلایا اور یہ کہا کہ اسی موقع پر اپنا تازہ کلام سنائیں گے۔ ایسا کلام جس کے چھپنے کی اس زمانے میں ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ تاکید کر دی کہ ساڑھے

سات بجے تک ضرور پہنچ جائیں ۔ ورنہ اس کے بعد ان پر شراب کا اثر خراب ہونے لگتا ہے ۔ اس دن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہمیں ان کے یہاں پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹے کی تاخیر ہوگئی ہم لوگوں نے سوچا کہ شراب تو پیتے نہیں ۔ اس لئے ذرا اطمینان سے چلیں گے ۔ ہماری عدم موجودگی میں دو ایک دور ہو جائیں گے تو مناسب ہوگا ۔ بہر حال ہم لوگ کوئی سوا آٹھ بجے کے قریب پہنچے تو دیکھا جوش صاحب بوتلیں بھرے بیٹھے ہیں ۔ ان کا موڈ ہمارے دیر میں پہنچے سے خراب ہو چکا تھا دیکھتے ہی برسنے لگے ۔

''اچھا تو آپ لوگ تشریف لے آئے''

میں نے کہا:

''جوش صاحب ! ہم لوگ بہت شرمندہ ہیں ۔ ہمیں دیر ہوگئی ۔ راستے میں ایک صاحب نے پکڑ لیا ۔ لاکھ کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی اور ہمیں نہ چھوڑا''

جوش صاحب کہنے لگے:

''آپ لوگ مجھے گولی مار دیجئے ۔ ۔ ۔ قتل کر دیجئے ۔''

اس پر مجھے ہنسی آ گئی لیکن میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا:

''جوش صاحب ! ہم دونوں معذرت خواہ ہیں ۔ آپ معاف کر دیجئے ۔''

انہوں نے پھر کہا !

''جب دوست کو دوست کا خیال نہ رہے تو دوست کو چاہیئے کہ دوست کو گولی مار دے ۔''

ان باتوں میں ہلکی سی خفگی ضرور تھی لیکن دراصل یہ باتیں وہ انتہائی محبت میں کہہ رہے تھے ۔

میں نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی اور کہا :

''جوش صاحب !اب وہ کلام سنا دیجئے جس کے سنانے کا آپ نے وعدہ کیا تھا ۔''

کہنے لگے ....

''اب وہ کلام کیسے سناؤں ؟ جب دوست ، دوست کو دوست ہی نہ سمجھے تو اُسے کلام سنانے سے کیا حاصل ؟''

غرض دیر تک وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اصل میں وہ نشے میں تھے اور ہمارے دیر میں پہنچنے سے ان کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں منایا اور منانے کے بعد پھر دیر تک کلام سُنا۔

احباب ہی کے ساتھ جوش صاحب کبھی کبھی اس طرح بگڑ لیتے ہیں ورنہ کسی اور کے ساتھ انہیں بگڑنا نہیں آتا۔ ناراض ہونا تو وہ سرے سے جانتے ہی نہیں۔ صرف بے تکلف احباب ہی سے وہ ناراض ہو لیتے ہیں لیکن ان کے اس ناراض ہونے میں بھی حد درجہ محبت ہوتی ہے۔

جوش صاحب کے یہ احباب جب تک یک جو ہو کر بیٹھتے ہیں۔ تو رندی اور قلندری کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ اس رندی اور قلندری کے بغیر جوش صاحب زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ ان کے مزاج کا جزو ہے۔ اس کے بغیر انہیں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ سانس لینی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تو جوش صاحب کی رندی اور قلندری کو الگ کر لیجئے تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

شاعر انقلاب کے مزاج میں رندی اور قلندری ضرور ہے۔ انہوں نے اس رندی اور قلندری کو اپنی ساری شخصیت پر طاری کر لیا ہے لیکن ان کی شخصیت کی اس خصوصیت نے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بیگانہ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رندی کے باوجود اپنی گھریلو زندگی میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ یوں شادی شدہ زندگی کو وہ ہمیشہ صلواتیں سناتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ زندگی انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ شوخی اور شگفتگی کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ چنانچہ جب بھی کوئی نوجوان اُن سے ملتا ہے تو وہ اس موضوع پر اس سے گفتگو ضرور کرتے ہیں۔ پوچھتے ہیں ..... ''کیوں صاحب آپ نے شادی کی یا نہیں؟'' اگر اس نے کہا..... ''جی نہیں'' تو ان کے منہ سے نکلے گا۔ الحمد اللہ، آپ اس لعنت سے محفوظ ہیں۔ ہرگز شادی نہ کیجئے گا۔ انسان کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کولھو کا بیل ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر اس نے جواب دیا۔ ''کہ کر لی ہے'' تو وہ کہیں گے۔ ''اِنَّا اللہِ وَاِنَّا اَلَیہِ رَاجِعُونَ۔ خدا آپ پر رحم کرے۔''

اس موضوع پر انہوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی ہے جو اکثر نوجوانوں کو سنا بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ان کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی ان کی یہ زندگی رندی اور قلندری کی راہوں میں حائل ضرور ہوتی ہے لیکن انہوں نے اس کے باوجود اس

زندگی کی مسرتوں کو محسوس کیا ہے اور وہ اس کی اہمیت کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کی گھریلو زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اہلیہ اور بچوں کا خیال رکھا ہے۔ انہیں ان سب سے محبت ہے۔ اگر کسی سے وہ اس زندگی میں خوف کھاتے ہیں تو وہ ان کی اہلیہ ہیں جنھیں وہ ہنسی سے ''اُم الشعرا'' کہتے ہیں۔ انہوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب تک ان کا خاتمہ ہو چکا ہوتا، اگر ان کی اہلیہ ان کی غیر معتدل زندگی میں اعتدال نہ پیدا کرتیں۔ اسی لئے تو وہ کہتے ہیں۔

> ''میری بیوی نے اپنی سخت گیری سے جو توازن میرے اندر پیدا کیا ہے اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے، وہ میرے لئے ایک بریک رہی ہیں بریک۔''

جب بھی وہ غلط راستے پر چلے ہیں انہیں روکا ہے۔ جب بھی انہوں نے حد سے زیادہ تجاوز کیا ہے انہوں نے بری طرح ان کی خبر لی ہے۔ جب بھی وہ اعتدال اور توازن سے ہٹے ہیں تو انہوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ طبیعت ٹھکانے ہوگئی ہے۔ اپنی اولاد کو انہوں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔ اس حد تک کہ لڑکی اور داماد کو اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ گھریلو زندگی کا اس قدر خوشگوار ہونا جوش صاحب کے ایسے انسان کے لئے کسی حد تک عجیب ضرور ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ جوش صاحب کی زندگی کے اس پہلو نے ان کی شخصیت کو عظمت سے ہمکنار ہونے میں مدد کی ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جوش صاحب شاہد وشراب کے والا وشیدا ہیں۔ وہ اس دنیا کے انسان ہیں ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ انہیں کے لئے جیتے ہیں انہیں کے سہارے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں ہر وقت شاہد وشراب کا دور دورہ نہیں رہتا۔ اس کے لئے انہوں نے وقت کی تعین کر رکھتی ہے۔ شام کا وقت اسی کام کے لئے ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ جیسے ہی شام کی سیاہی چھانے لگتی ہے وہ محفل نائے ونوش کو آراستہ کر لیتے ہیں۔ دن بھر انہیں اس محفل کے آراستہ کرنے کا خیال رہتا ہے۔ اور وہ اسی خیال میں دن کا سفر طے کر کے شام کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ بقول ان کے

> ''شام ہی کا وقت ایسا ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو پانے کی کوشش کرتا ہوں، ورنہ دن بھر تو بھٹکتے ہی گزرتی ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ شام کے وقت انہیں دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے جیسے واقعی بھولے بھٹکے راہی کو منزل سے ہمکنار ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دن بھر کی بے چینی اور اضطراب کے بعد یہی وقت ہوتا ہے۔ جب مسرت ان پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ اور وہ اس میں اپنے آپ کو غرق کر دیتے ہیں۔

جوش صاحب شام کے وقت کو مسرت، راحت اور آرام کا وقت سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ کوئی سنجیدہ بات کوئی علمی گفتگو کرنے اور سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس وقت تو ان کے خیال میں صرف مسرتوں سے اپنی جھولیوں کو بھرنا چاہیئے۔ زندگی سے رس نچوڑنا چاہیئے کیونکہ اسی عالم میں زندگی ان باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔

دلّی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے !

''عرصہ ہوا، اتفاق سے دلّی میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، ملیالم، کناری، تمام زبانوں کے بعض مشہور ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کو یکجا کرنے کی ایک صورت نکالی گئی تاکہ باہم تبادلۂ خیالات سے ہر ایک کو دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ اس کام کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس کا ایک جلسہ سہ پہر کے وقت منعقد ہوا۔ تمام زبانوں کے ادیب اس میں شریک ہوئے۔ یہ ایک تاریخی جلسہ تھا۔ مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔''

جوش صاحب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ آخر میں بعض لوگوں نے یہ اصرار کیا کہ جوش صاحب ادب اور مسرت کے رشتے پر روشنی ڈالیں لیکن شام ہو چکی تھی۔ اس لئے جوش صاحب پر بے چینی اور اضطراب کا عالم تھا۔ فرمائش پر کہنے لگے۔

''صاحب ! آپ حضرات دیکھتے ہیں، اس وقت کائنات کی ہر چیز آرام اور سکون چاہتی ہے لیکن آپ اس وقت مجھے سنجیدہ علمی گفتگو میں گھسیٹنا چاہتے ہیں اس وقت تو میرا جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی مست شباب میرے سامنے رقص کرے۔ اس کے رقص کی جھنکار مسرت کے تمام رازوں

کو آشکار کردے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح محفل برخاست ہوگئی۔ سب لوگ شاعر انقلاب کی اس بات پر خوش خوش رخصت ہوئے۔

شام کے وقت جوش صاحب اکثر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہر کام کا ایک وقت ہونا چاہیئے اور شام کے وقت سوائے شاہد و شراب سے دلچسپی لینے کے اور کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

اس لئے شام ہوتے ہی جوش صاحب کی محفل جم جاتی ہے۔ کاگ اُڑتے ہیں۔ پیالہ و ساغر کھنکتے ہیں، مئے و مینا کا رقص شروع ہوجاتا ہے۔ جوش صاحب خود بھی پیتے ہیں اور پینے والے احباب کو بھی پلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ نہیں پیتے ان سے اصرار نہیں کرتے، اس سلسلے میں وہ بہت محتاط ہیں۔ جو لوگ شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم لوگوں کو تو انہوں نے ''بچہ پارٹی'' کا خطاب دے رکھا ہے۔ یہ خطاب ایک بڑی ہی رنگین اور پُر کیف محفل میں دیا گیا۔ ایک شب کوئی دلّی میں ایک صاحب نے ان کو دعوت شراب دی تھی۔ حالانکہ وہ تنہا مدعو تھے، لیکن انہوں نے مجھ سے اور بعض دوسرے احباب سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ جوش صاحب کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کبھی تنہا کسی دعوت میں نہیں جاتے۔ احباب کو ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کی دعوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو احباب بھی اس وقت ان کے ساتھ ہوں ان سب کی دعوت ہے۔ چنانچہ جوش صاحب ہمیں زبردستی اس دعوت میں لے گئے۔ ہم لوگ اس جگہ پہنچے تو دیکھا رنگ و بو کا ایک طوفان ہے جو وہاں اُمڈا ہوا ہے۔ نازنینان عشوہ کار کا ایک جھرمٹ ہے اور ان کے قریب ہی ایک میز پر قرینے سے رنگ رنگ کی شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ مجھے وہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جوش صاحب نے پہنچ کر ہمارا تعارف کرایا۔ اور ہم اس رسمی تعارف کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے گزرنے نہیں پائے تھے کہ ایک صاحبہ نے سب کے ساتھ میرے سامنے بھی شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ میں اس منظر کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا اور معاً میرے منہ سے نکلا:

''شکریہ...... معذرت خواہ ہوں۔''

جواب ملا:

''اچھا تو آپ شوق نہیں فرماتے۔''

میں نے کہا :

''جی نہیں .... محروم ہوں ۔ میں پیتا نہیں، صرف دیکھتا ہوں۔''

فرمایا :

''لیکن دیکھنے سے کیا فائدہ؟''

میں نے جواب دیا:

''نشہ تو دیکھنے سے بھی ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت بھی نشے میں ہوں۔''

اس پر وہ صاحبہ کچھ شرما سی گئیں۔ چہرے پر ایک سرُخی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے میرا مطلب سمجھ لیا تھا۔ اس وقت تک جوش صاحب گلاس ہاتھ میں لے چکے تھے اور اس گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جب ان صاحبہ کو شرماتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے۔ صاحب ! انہیں معاف ہی کر دیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ پیتے پلاتے نہیں۔ صرف دیکھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں دیکھنے ہی سے انہیں نشہ ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ ''بچہ پارٹی'' ہیں۔

اس پر عام حاضرین ہنسنے لگے!

خیر، یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ''بچہ پارٹی'' نائے ونوش کی محفلوں میں بھی جوش صاحب کے ساتھ رہتی ہے لیکن وہ ان سے شراب پینے کے لئے اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ چائے پینے اور کچھ کھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ بس تو پھر ایسی محفلوں میں یہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب تو پیتے ہیں اور ''بچہ پارٹی'' کھانے میں مصروف رہتی ہے اور جوش صاحب اس پر خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ نوجوانوں کا شراب پینا انہیں خود بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اس چیز کو ان کے لئے صحیح معنوں میں اُم الخبائث سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا اُظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ان کی محفل نائے ونوش ایک محفل وعظ میں تبدیل ہو جائے گی، انہیں اس کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے محض انداز میں شراب کی تعریف ہی کرتے رہتے ہیں۔ اس کی عظمت کے گن ہی گاتے رہتے ہیں۔ شراب کی محفل میں وہ شراب کی تعریف نہ کریں تو انہیں چین نہیں پڑتا لیکن یہ

تعریفیں بڑے ہی دلچسپ اور پُر لطف انداز میں ہوتی ہیں۔ مجھے تو ان تعریفوں ہی میں شراب کا لطف آجاتا ہے۔

ایک شام کو اپنی مخصوص محفل میں جوش صاحب کہنے لگے:

''عبادت صاحب! ایک دن نہا دھو کر آیئے۔''

میں نے کہا:

''خیریت، یہ آپ کو اس وقت نہا دھو کر آنے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟''

کہنے لگے:

''نہا دھو کر آیئے تو پھر بتاؤں گا۔ پہلے وعدہ کیجئے۔''

میں نے کہا:

''اچھا منظور ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، لیکن پھر ہوگا کیا؟''

کہنے لگا:

''ہوگا کیا؟.....صرف یہ ہوگا کہ اس طرح آپ کا ''کفر'' ٹوٹے گا، ''ارتداد'' دور ہوگا، اور شراب سے رغبت ہوگی۔ یہ چیز بڑی ہی پاکیزگی کا تقاضا کرتی ہے۔''

میں نے کہا:

''بے شک صحیح ہے۔ جب ہی تو یہ ہم ایسے گندے اور گنہگار لوگوں کے پاس نہیں پھٹکتی۔''

جوش صاحب ہنس کر کہنے لگے:

''آپ کا کفر نہیں ٹوٹے گا۔''

میں نے کہا :

''جوش صاحب ! ہم نے تو جنت ہی میں پینے کی قسم کھائی ہے۔''

کہنے لگے:

''سنیئے'' ایک رباعی یاد آگئی۔

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری

جنت کی دعاؤں میں بڑھاپا کاٹا
حوروں کی تمنا میں جوانی گزری

غرض شراب کی تعریف میں جوش صاحب اس طرح کی بے شمار باتیں کرتے ہیں۔اور ان کی یہ باتیں لطف سے خالی نہیں ہوتیں۔میں تو ان باتوں پر جھومتا رہا ہوں۔میرے نشے کے لئے تو ان کی یہ باتیں ہی کافی ہوتی ہیں۔

جوش صاحب کبھی تنہا شراب نہیں پیتے کہتے ہیں۔تنہا شراب پینے سے شراب کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ماضی کی تمام تصویریں بھوت بن کر شراب پینے والے کے سامنے آجاتی ہیں۔اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر ڈرتا ہے۔اس کے لئے تو یہ ایک کرب کا عالم ہوتا ہے۔اسی لئے جوش صاحب اپنے ہم مشربوں کو جمع کر کے ہر شام ایک محفل جماتے ہیں اور دعوتِ نائے ونوش دیتے ہیں۔

میں نے جوش صاحب کو شراب پینے کے بعد بہکتے ہوئے بہت ہی کم دیکھا ہے۔نشے کے عالم میں وہ موٹر تک چلاتے ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اعصاب مضبوط ہیں اور اعصاب مضبوط اس وجہ سے ہیں کہ شراب کے معاملے میں انہوں نے زندگی بھر اعتدال سے کام لیا ہے۔وہ خود کہتے ہیں شراب مجھ پر حاوی نہیں ہو سکی ہے، میں شراب پر حاوی ہو گیا ہوں، اسی لئے وہ شراب پینے کے بعد نشے کے عالم میں موٹر تک چلا سکتے ہیں۔میں تو جب بھی اس عالم میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھا ہوں۔تو میری جان نکل گئی ہے۔لیکن آج تک کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

شراب کا نشہ جوش صاحب پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔اس عالم سرخوشی میں ان کی باتیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔لطیفے سناتے ہیں۔کلام سناتے ہیں اور اس لئے ان کی یہ محفل باغ و بہار بن جاتی ہے۔

جوش صاحب کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوتا!

شاعر انقلاب کی زندگی میں یوں بڑا اعتدال ہے۔شراب نوشی تک میں جو اعتدال سے کام لے اس کی بڑائی سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس اعتدال کے باوجود معمولی طور پر دیکھا جائے تو ان کی زندگی میں خاصا لا اُبالی پن نظر آتا ہے۔ایک ایسا لا ابالی پن جس کی جھلک، ہر جینس GENIUS میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔یوں دیکھئے تو شاعرِ

انقلاب کی شخصیت میں بڑی باقاعدگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں، صبح کو طرف چمن وصحن بیابان میں، دن کو شہر وہُنر وکوئے ادیباں میں، شام کو رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں، اور رات کو بزم طرب وکوچۂ خوباں میں نظر آتے ہیں۔اس معمول میں کبھی بھی فرق نہیں آتا،لیکن اس باقاعدگی کے باوجود ان کے مزاج میں بے قاعدگی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عملی آدمی نہیں ہیں۔جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔وہ جذباتی، تخیلی اور روحانی ہیں۔انہیں کسی ایک جگہ پر قرار نہیں، سوچتے نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں۔لیکن کرتے کچھ بھی نہیں ،ان کی طبیعت میں ایک فطری لاپروائی ہے۔اس لاپروائی نے انہیں زندگی میں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ان کی ساری جائیداد اسی لاپروائی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔جائیداد کے سلسلے میں جو مقدمے ہوئے ہیں، ان کی پیروی جس طرح ہونی چاہیئے۔وہ ان سے نہیں ہو سکی ہے۔پیشی کی تاریخ گزر جانے کے بعد انہیں پیشی کی تاریخ کا خیال آیا ہے۔ان حالات میں پیروی بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ سوائے شاعری کے انہوں نے کسی کام کی طرف بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی ہے۔تن آسانی بھی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔وہ عملی زندگی میں محنت اور جفاکشی سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔

یہ تمام باتیں ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔انہیں خود بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔وہ ان خامیوں کو سمجھتے ہیں۔ان کا شعور رکھتے ہیں۔میں نے ان خامیوں کا ذکر کر کے انہیں خود اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ملامت تو وہ اپنے آپ کو بہت کرتے ہیں۔اپنی کوئی خامی ذہن میں آئے گی یا کسی کمزوری کا احساس ہوگا، بیٹھے بیٹھے کہہ اُٹھیں گے۔''صاحب! ہم بڑے نالائق ہیں۔ہمیں تو مرجانا چاہیئے، ہمیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔یہ لااُبالی پن نہیں ہے۔عملی زندگی سے ایک بے نیازی کی سی کیفیت ہے اور یہ بے نیازی ہر جینس GENIUS کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔

اس لئے اس لااُبالی پن، اور بے نیازی سے شاعر انقلاب کی شخصیت کی عظمت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ان کی بڑائی میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

شاعرِ انقلاب بنیادی طور پر ایک شاعر اور فن کار ہیں اور ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو، ان کی یہی شاعری اور فن کاری کا تعلق ہے۔ان کی شخصیت اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔صورت

سے انداز سے چال ڈھال سے گفتگو سے وہ شاعر اور صرف شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ان کی شخصیت میں بانکپن اور طرحداری سے ملی جلی وہ جو ایک معصومیت اور سادگی ہے اس خیال کو حقیقت بنا دیتی ہے۔ ہوشمند اور باشعور ہونے کے باوجود وہ جو ہر چیز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھنے والی کیفیت ہے اس سے بھی یہ خیال صحیح ثابت ہوتا ہے۔ باوقار اور پر تمکین ہونے کے باوصف وہ جو آن کی آن میں ہر حسین چیز پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا انداز ہے، اس سے بھی اس خیال پر صداقت کی مہر لگتی ہے۔غرض ان کی ہر بات سے شاعر اور فن کار ہونا ٹپکتا ہے اور شخصیت کی یہ شاعرانہ اور فنکارانہ خصوصیات ان کے لااُبالی پن یا عملی زندگی سے بے نیازی کو بڑی حد تک پسِ منظر میں ڈال دیتی ہے۔ جوش صاحب کی شاعرانہ اور فن کارانہ عظمت کے پیشِ نظر ان خامیوں کو نظر انداز کر دینے کو جی چاہتا ہے۔اسی لئے میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جوش صاحب کے اس لااُبالی پن کو برداشت کر لیتے ہیں۔جن کے مزاج میں باقاعدگی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔اسی لئے جوش صاحب کے پرستاروں میں رندان بلانوش اور عاشقان جنون کوش سے لے کر واعظانِ خشک اور زاہدانِ بے رنگ تک شامل نظر آتے ہیں۔ایک شخص جوان سے ایک بار مل لیتا ہے، ان کی جاذب نظر اور دل میں کھب جانے والی شخصیت کا دلدادہ ہو جاتا ہے اور پھر ساری زندگی ان کا دلدادہ ہی رہتا ہے۔

جوش صاحب کی اس رنگارنگ پُر کیف اور دلآویز شخصیت میں ان کی شاعرانہ عظمت اور فن کارانہ فوقیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔اسے چار چاند لگا دیئے ہیں۔وہ ایک انسان اور دوست ہی کی حیثیت سے عظیم نہیں ہیں۔ایک شاعر اور فن کار کی حیثیت سے بھی عظیم ہیں اور ان کی اس شاعرانہ اور فن کارانہ عظمت کا راز، انسانی زندگی کے شدید احساس، گہرے شعور اور اس احساس وشعور کے ہاتھوں پیدا ہونے والے افکار وخیالات کے حسین اظہار میں مضمر ہے۔ جوش صاحب نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی اور اس کے متنوع پہلوؤں کو جس شدتِ احساس اور علوئے فکر کے ساتھ حسین ترین فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس کی مثال اردو میں تو کیا، دنیا کی اور زبانوں میں مشکل ہی سے ملے گی۔ جوش صاحب کی شاعری اردو ہی میں اضافہ نہیں، دنیا بھر کے ادب میں ایک اضافہ ہے۔انسانی زندگی کا کون سا پہلو ہے، جو اس میں موجود نہیں۔اس میں انسان ہے، اس کی دلچسپیاں ہیں، اس کی آرزوئیں ہیں، اس کی تمنائیں ہیں، اس کی حسرتیں ہیں، اس کی ناکامیاں

ہیں، اس کی کامرانیاں ہیں، غرض وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی زندگی میں ہوتا ہے اور جس کو انسانی زندگی میں ہونا چاہیئے۔ جوش صاحب ایسی انسانی زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ شاعر انقلاب ضرور ہیں ۔شاعرِ شباب بھی انہیں کہا گیا ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ان دونوں سے کہیں زیادہ شاعرِ حیات کا لقب ان پر پھبتا ہے۔

وہ شاعرِ حیات ہیں کیونکہ انسان ہیں اور انسان ہیں، اس لئے شاعرِ حیات ہیں۔ اسی لئے توان کی شخصیت سے قربت حاصل کرنے والے ہر شخص کو ان پر پیار آتا ہے۔!

☆☆☆

جوش اور عظمتِ انساں

محمد علی صدیقی

جوش ناگزیر طور پر جوش تھے جو حضرات جوش کی حمایت میں کچھ اس طرح سوچتے ہیں کہ آخر جوش نے ''نئے خیالات'' کی وکالت میں اس درجہ تندہی کا مظاہرہ ہی کیوں کیا کہ وہ متنازعہ فیہ شخصیت بن کر رہ گئے۔ وہ جوش کی عظمت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اگر جوش اپنے معترضین کے لئے ناپسندیدہ شخصیت تھے تو یہ ایک ایسا اختصاص ہے جس پر جوش فخر کر سکیں گے۔ انسانی فکر کی ترقی ''اقرار'' اور ''انکار'' کی سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ یہ ایک ایسی منزل کی جانب سفر ہے جہاں جوش اپنے معترضین کے لئے بھی ایک گراں قدر اثاثہ بن جاتے ہیں۔ معترضین حضرات اس طرح اپنی صفوں کی زیادہ بہتر ترتیب کے ساتھ ساتھ اپنی فکر پر ''براسو'' پالش کے دو ہاتھ بھی مار سکیں گے۔ کیا حرج ہے اگر تھوڑی سی محنت ان حضرات کے حصے میں بھی آ جائے۔ جو اپنے مفروضات کی صدیوں پرانی چھاؤں میں پاؤں پسارے پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ جب کہ ان کا اردگرد اس تیزی کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے کہ وہ چھاؤں بھی بذاتِ خود معرضِ خطر میں ہے۔

جوش نے فرسودہ اقدار کے تار و پود میں جس بے رحمی کے ساتھ دراڑیں ڈالی ہیں وہ اس قدر سنگین نوعیت کی ہیں کہ انھیں پسِ پشت ڈالنا ممکن بھی نہ ہو سکے گا۔ سلیم احمد جیسے روایت پسند

دانشور نے اپنے مضمون ''جوش اور خدا'' میں ان دراڑوں پر کافی دبیز پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم احمد جوش کے معترضین کے لئے ہدفِ ملامت بن چکے ہیں۔ معترضین جوش کم از کم سلیم احمد سے اس قسم کی دریا دلی کی توقع نہ رکھتے تھے کہ وہ اس نازک لمحے میں ''جدید'' ذہن کا ساتھ دے بیٹھیں گے۔ لیکن سلیم احمد بہر حال وحدت الوجودی ہیں۔ جوش ''اقرار'' اور ''انکار'' کی حقیقت سے آشنا تھے۔ لیکن ان کی شاعری میں آخر وہ کون سا عقدہ لاینحل ہے جو حل طلب ہے۔ جوش تجسس پسند تھے۔ سوالات کرتے رہتے تھے۔ اکثر و بیشتر جوابات بھی خود ہی دے لیا کرتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کے معترضین ان کے بارے میں جو حکم چاہیں صادر فرما دیں۔ جوش کا کلام ایک بحرِ ذخار ہے جس میں ہر ''موڈ'' کی ترجمانی موجود ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ جوش کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ یا پھر یہ کہ آپ خود کو جوش کی شاعری کے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھئے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے؟ یہاں یہ ضروری ہے کہ جوش کے ذہنی ارتقا اور ان کے دور کے سیاسی اور سماجی ماحول اور ''اقرار'' و ''انکار'' کے پیمانوں میں ہمدردانہ غور و فکر شرط اوّل ہے۔ تا کہ حقیقت کا متلاشی ذہن پہلے سے قائم شدہ مفروضات کی عصبیت کا شکار ہو کر نہ رہ جائے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہو پاتا ہے۔ ہم دوسروں کے کلام اور تحریروں کی راہوں میں اس قدر رکاوٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں کہ مطالعہ کی ہر کوشش بسا اوقات اپنے تعصبات سے مڈ بھیڑ اور اس کے نتیجے میں انتشار پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ چاہیئے، یہ بھی ایک طرح کی آزادی ہے۔ مفروض کو موضوع سمجھ بیٹھنے کی سہل نگاری اگر نارسائی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ مثلاً جوش کے سلسلے میں ایک عام گمرہی یہ ہے کہ ہم ان کی قادر الکلامی میں کیڑے نکالنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کے اختصار پسند قاری کے ذہن پر ایک مضمون کو سو سو رنگ میں باندھنے کا مظاہرہ گراں گزرتا ہے اور معترضین یہ حقیقت فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ جوش کی قادر الکلامی ان کا تہذیبی ورثہ ہے۔ جوش اس طرح کلاسکی شعرا کے سامنے خم ٹھوک کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ آخر جوش صاحب سے ان کی کلاسکی افتادِ طبع کے باوجود ہیئت کے معاملے میں تجدد پرستی کا مطالبہ ہی کیوں کیا جاتا ہے۔ جوش عربی اور فارسی ادب سے دوری یا بیزاری یا لاتعلقی میں سے کسی مجبوری کا شکار نہ تھے۔ کیا موجودہ نسل جوش اور اپنے مابین کسی ایسے میثاق کو بطور ثبوت پیش کر سکتی ہے جس کے رو سے جوش نے مسدس، قصیدہ اور مثنوی جیسے اصناف سے پہلو تہی کا وعدہ کیا ہو۔

جوش بہ اعتبارِ فکر جدید تھے۔ وہ اس حد تک ''جدید'' تھے کہ وہ آج سے سولہ سال قبل کی ایک تحریر میں روایت پسندوں کی عقل دشمنی پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''صد حیف کہ اپنے ''سروں'' کو معزول کر کے ہم نے اپنے ''کانوں'' کو راہنمائی کا منصب عطا فرمایا ہے۔ عقل کو کہنی مار کر جذبات اور مجذوبیت کو گلے لگایا ہے اور ''کھوپڑی'' پر پاؤں رکھ کر ''چھاتی'' کو ہم نے سروں پر بیٹھا لیا ہے اور اپنی اس روش کے چلتے ان اقوام کے سامنے جو زندگی کے فرق پر تسخیر قوائے کائنات کا تاج رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ آج ہم جاہلوں، بیماروں، بھوکوں، ننگوں، ٹھگوں اور بھک منگوں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحِ کائنات ہم سے مایوس ہو چکی ہے اور زندگی نے ہم سے دست برداری کا فیصلہ کر لیا ہے اور بیشک سیاسی مایوسی دست برداری کا نتیجہ ہے کہ ایوانِ حسیات وقصر کائنات کا وہ مضبوط قفل جو صرف تفکر کے لوہے سے پگھل کر گھل سکتا ہے۔ ہم اسے موباف کے تاگوں اور ترکی ٹوپیوں کے پھندے سے کھولنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ پس جس نے پہلے نہ سنا ہو وہ اب سن لے کہ جس وقت تک ہم اپنے کو سائنٹفک مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیں گے، آگاہی وہ دیدہ وری کے بغض سے توبہ نہیں کر لیں گے سماعت کے میدان میں کبڈی کھیلتے اور عقل کا نام سن کر دولتیاں جھاڑتے رہیں گے۔ اس وقت زندگی ہم سے منہ موڑتی رہے گی۔''

(جنگ کراچی، ۲۲ رجنوری، ۱۹۵۶ء)

جوش کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ آخر وقت تک ثابت قدم رہے اور انسانیت کی ثنا خوانی کرتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ جوش کے کلام میں زوائد (Redundancies) کا وفور ہے۔ آخر ہم اس حقیقت سے کس لئے آنکھیں چرائیں کہ وہ ایک شعری اسلوب کے خاتم تھے اور یہ

''زوائد'' جوش کے شعری اسلوب کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ یہ شعری اسلوب ایک عرصے سے حریت فکر سے تہی دامن تھا۔ جوش نے اس روایت کے دامن میں اپنی روایت کے اس قدر گہر ہائے آبدار کا اضافہ کیا کہ انھوں نے ہیئت کی ژولیدگی کا نظریہ فاش فاش کر دیا۔ ہر چند کہ جوش بقول احسان دانش ''اپنی شعری روایت کے ''بڑوں'' میں شمار ہوتے تھے۔'' لیکن انھوں نے بعض جدید ترین شعرا کے مقابلے میں زیادہ ''جدید'' رویہ کا مظاہرہ کیا۔ جوش کا خیال تھا کہ وہ اس دنیائے دارو گیر میں قبل از وقت پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا ظہور ناگزیر تھا۔ جوش اپنی نظم ''میرا مرثیہ'' میں کہتے ہیں۔

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے
ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا
ارے اس عالمِ تعجیل خو نے
یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا

اور یہ سب کچھ غالباً اس لئے کہ:

جہاں فکرِ جواں اگتی نہیں ہے
مرا اس خاک پر پودا لگایا
میں تھا بھی شاید ایک ایسا معما
کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
نفس کی آمدو شد اللہ اللہ
مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

اس اظہارِ تاسف سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جوش نے جس ''عالمِ تعجیل خو'' کی شکایت کی تھی وہ چنداں درست نہ تھی۔ انھوں نے مقدور بھر اپنا فریضہ انجام دیا۔ ہر چند کہ وہ اپنے زمانے کے شاکی تھے۔

ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں زاغ و عندلیب
اس گلستاں میں مرغ خوش الحاں ہوئے تو کیا

جس تیرگی میں ہو نہ سکندر نہ روئے خضر
اس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا

لیکن تاریخ ثابت کرے گی کہ یہ شکایت بے جا تھی۔ جوش جیسے شاعروں کے ساتھ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ تاریخِ ادب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

خواہ جوش بہ اعتبار فکر ''سروں'' کی معزولی اور ''کانوں'' کی رہنمائی کے لاکھ مخالف ہوں لیکن وہ اپنی شاعری کا جادو صرف ''سروں'' ہی کے راستے نہیں بلکہ ''کانوں'' کے راستے بھی جگاتے ہیں۔ ''سر'' فکر کی علامت ہے اور ''کان'' روایت کی۔ جوش اس طرح تازہ فکر اور قدیم اسلوب شاعری پر یکساں فریفتہ تھے۔ اس لئے ہم جوش کی شاعری میں زوائد کو موسیقی اور ڈرامے کا روایتی روپ قرار دے سکتے ہیں۔

جوش نے اردو شاعری کو اس درجہ مالا مال کیا ہے کہ وہ زبان کو مالا مال کرنے کے باب میں قلی قطب شاہ نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی صف میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں جوش اور انگریزی شاعری میں ملٹن کے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہ دونوں شعری زبان کے جملہ امکانات کھنگالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جوش زبان پر اپنی بھرپور قدرت سے فائدہ اٹھانا نہ چاہتے ہوں وہ زبان کے طمطراق سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اپنی فکر کی سچائی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ غزل کی روایت میں طویل فکری نظموں کے لئے راہ ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سینئر ہمعصر اقبال نے بھی یہی طریقۂ کار اپنایا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جوش کے لئے ان کے بعض جدید ہمعصروں نے وہی سب کچھ کہا جو ایلیٹ اور اس کے ہم نواؤں نے ملٹن کے بارے میں کہا تھا۔ یہی کہ ملٹن کے یہاں زبان کی گھن گرج کے علاوہ اور کیا ہے لیکن جس طرح ایلیٹ مآل کار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے خیال پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ملٹن کی ''عظمت'' تسلیم کی بعینہ اسی انداز میں جوش کی عظمت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ بس زوائد کی شکایت پر اکتفا کیا جا رہا ہے لیکن اگر ان زوائد کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے گنجائشیں پیدا کر لی جائیں تو پھر جوش کی عظمت کے اعتراف میں آخری رکاوٹ بھی دور ہو سکے گی۔

افسوس کہ جوش ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے انیس مجموعہ ہائے کلام ایک

ایسے دور میں ایوانِ اردو کے پُرشکوہ فانوس میں اپنی روشنیاں جلاتے رہیں گے جب ہر جانب ''روشنی، روشنی پکارا ے دل'' کی صدائیں عام ہوتی چلی جارہی ہیں۔

اب میں مختصراً جوش کے شعری سفر کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ جوش کی شاعری کے جس وصفِ خاص کی جانب بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی وہ جوش اور فطرت پرستی کا موضوع ہے۔ یوں لگتا ہے کہ نادر کاکوروی اور ان کے قبیل کے فطرت پرستوں نے اردو شاعری کو جس نت نئے مضامین سے روشناس کرانے کی ذمہ داری قبول کی تھی جوش نے اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ جوش نے یہ منزل عقل وخرد کی روشنی میں طے کی۔ انھوں نے انگریزی زبان کے رومانوی شعراٴ کے تتبع میں بیزاری کا وطیرہ اختیار کرنے کی بجائے فطرت کی کتاب فراست سے تغیر اور پیہم تشہیر کا درس لیا۔ یہ انوکھی معاملت، جوش کی فکر کے ہر گوشہ پر حاوی ہے اور اس زاویۂ نگاہ کی مدد سے سیاسی وانقلابی شاعری حتیٰ کہ رومانوی شاعری کا لب ولہجہ بھی زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ جب جوش نے اپنے والد بزرگوار کی معیت میں ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں مولانا رضا فرنگی محلی (لکھنؤ) کے مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعر پڑھا ۔

اے نسیمِ صبح کے جھونکوں یہ تو نے کیا کیا
میرے مستِ خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

تو اسی وقت مرزا محمد ہادی رسوا نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور صفی لکھنوی نے جی بھر کر داد دی تھی۔ روحِ ادب (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) میں شامل نظم ''ترانۂ بیگانگی'' جوش کے ذہن کی اولین کروٹ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس نظم کے چند سطور ملاحظہ فرمائیے..........

زہر لگتی ہے زمانے کی مجھے آب و ہوا
ظاہری اسباب کو چھوڑے زمانہ ہو گیا
چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہو گیا
خوبیِ قسمت کا فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہمدم سبزہ زار ِ کوہ صحرا ہو گیا
دوست میرا چشمہ و گلزار و دریا ہو گیا

لیکن جوش کی فطرت پرستی نے جہاں ان کے ذہن کو رفعت دی وہیں یہ احساس بھی دیا۔

دنیا بڑی وسیع تھی لیکن مرے لئے
آزادیٔ خیال نے زنداں بنا دیا

رابندر ناتھ ٹیگور نے جوش کی فطرت پرستی اور اس سے فطری استنباط کی خواہش کے اعتراف میں انھیں ''فرزندِ سحر گاہ'' کا خطاب دیا تھا۔ جوش ملیح آبادی کی فطرت پرستی کے اعلیٰ نمونے مرثیوں میں موتیوں کی مانند بکھرے پڑے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوش منظر کشی کے ہنگام بھی عقل و خرد کی گتھیاں سلجھاتے رہتے ہیں۔ اگر جوش کے نقاد فطرت پرستی کے جذبے ہی کو زوائد قرار دینا چاہیں تو وہ آزاد ہیں۔ مثلاً جوش آوازۂ حق (مشمولہ جوش ملیح آبادی کے مرثیے مرتبہ ضمیر اختر نقوی) کے ایک بند میں اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

غنچوں کی حیا، گل کی ہنسی، اوس کے گوہر
زرتار شفق، سرد ہوا، باغِ معطر
رنگین ہوا، قوسِ قزح، مہرِ منور
نغمے یہ پرندوں کے، پہاڑوں کے یہ منظر
ہے کون سی خوبی جو مہِ نو میں نہیں ہے
کیا باغِ ارم صبح کے پرتو میں نہیں ہے

اب ذرا ''آگ'' کا مندرجہ ذیل بند ملاحظہ فرمائیے........

آگ مطرب کا ترنم آگ تاروں کا گداز
آگ طوفانِ نیاز و چشمۂ تغیانِ ناز
آگ روئے رنگِ پرور، آگ چشمِ نیم باز
آگ جوہر کی حیا پرور توانائی کا راز
یہ نگارِ برق وش، ہر سوز میں، ہر ساز میں
گرمیٔ انفاس میں ہے، شعلۂ آواز میں

(آگ، ۱۹۵۹ء)

کیا یہ ایسی شاعری کی مثالیں نہیں ہیں جن میں لمحہ موجود کا اثبات اور جوہرِ توانائی کے علم کے ساتھ رشتہ موانست استوار نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیا جوش کا روایتی اسلوب اور مسدس کے فارم عقل و خرد کی ہمہ دم ضوفشانی کے اعتراف سے عاجز ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جوش کی اہمیت کا تعین اس بنیاد پر بھی ہو سکے گا کہ انھوں نے بڑے نامساعد حالات میں بھی عقل پرستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔وہ اپنی زندگی ہی میں اپنی فکر کے لاکھوں چراغ روشن کر چکے تھے۔ بڑے فنکار کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ اپنے شہ پاروں میں موجود رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے انگنت چاہنے والوں میں نسل در نسل ایک غیر مرئی وجود کی مانند زندہ رہے۔ جوش کے بارے میں زوائد تضادات اور اغلاط کی بحثیں چھیڑنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس قد کے ادیب کے خلاف کہنے کے لئے اب اسی قسم کی باتیں رہ گئی ہیں۔ رومی، حلاج، غالب اور اقبال کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن یہ حضرات اپنے معترضین کے اعتراضات کی وجہ سے یاد نہیں رکھے جاتے بلکہ اپنے تاریخی اثرات کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں لیکن میں جوش کے سلسلے میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ جوش کی تمام تر وکالت کے باوجود یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان کے کلام میں بعض توجہ طلب مراحل آتے ہیں۔ مثلاً جوش جیسے شاعر سے نطشے جیسے مفکر سے ارادت مندی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نطشے ہر اس مظہر سے جسے ''عوامی'' قرار دیا جا سکتا ہو یک گونا بیر رکھتا تھا اور اسے حسن، خیر اور عدل کے حق میں سمِ قاتل سمجھتا تھا۔ کیا جوش واقعتاً نطشے پر اس بنیاد پر لہلوٹ تھے کہ وہ ''اشرافیہ'' کی بالادستی کا قائل تھا اور جوش بھی ''یادوں کی بارات'' میں جاگیرداری کے خاتمے پر ملول و مضطرب نظر آتے ہیں۔ یہ امر واقعتاً حیرانی کا باعث ہے کہ جوش کے ذہن پر ''سنبل و سلاسل'' ۱۹۴۷ء'' کی اشاعت تک نطشے کے لئے اس قدر خیر سگالئی بلکہ مرعوبیت کا جذبہ سوار تھا کہ انھوں نے اس مجموعے کو ''امیر فکر و تخیل نطشے اعظم کے نام'' معنون کیا تھا۔ اس زمانے میں بسم اللہ کی جگہ ''بنام قوت وحیات'' لکھنے لگے تھے۔ اقبال بھی نطشے سے مرعوب ہیں۔ یہ پہلو تکلیف دہ ضرور ہے لیکن جوش کے معترضین جن کی اکثریت نطشے کے افکار سے بیحد متاثر ہے، جوش سے اس بنا پر بھی خوش نہیں ہو سکتے یہ حضرات جانتے ہیں کہ جوش عملاً نطشے کی فکر سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ نطشے خردافروزی کی روایت کے خلاف تھے اور جوش نے تمام عمر خردافروزی پر زور دیا ہے۔ جوش ''عظمتِ انساں'' میں کہتے ہیں.......

مرغ زارو چمن و وادیٔ و کوہ و صحرا
سبزہ و شبنم و ریحان و گل و سر و صبا
ذرہ و اختر و مہر و مہ دشت و دریا
سب یہ گونگے ہیں اٹھائے ازلی سناٹا
گرہِ ارض و سما کھول رہا ہے انساں
اس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

جوش کا تصورِ خداوندی اور انساں بھی کارخانۂ فطرت ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''عظمتِ انساں'' ہی کے ایک بند پر اس مضمون کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ بند جوش کے عقائد کے بارے میں سب سے واضح بیان کا درجہ رکھتا ہے۔

ذہن جس وقت کہ ہو جائے گا انساں آگاہ
تو نکل آئے گا خود پردۂ انساں سے الہ
وحدتِ انفس و آفاق کو پالے گی نگاہ
اور شریعت یہ کہے گی کہ تفکر ہے گناہ
شور ہوگا نہ رہے کوئی وفا کا دشمن
بیشک انسان کا دشمن ہے خدا کا دشمن

(۱۹۸۲ء)

☆☆☆

جوش یا فیض!

نامی انصاری

آج کل ہندوستان کے بعض ادبی حلقوں میں اس نکتے پر کافی زور دیا جا رہا ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر جوش ہیں۔ اس کے موئدین میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم، رفعت سروش اور سید عاشور کاظمی پیش پیش ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ'' میں، حرفِ آغاز ہی میں لکھ دیا ہے کہ ''اردو کے عظیم شاعروں کی فہرست میں صرف چار نام آتے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، انیس اور اقبال۔ اس کے بعد دوسری فہرست بڑے شاعروں کی ہے۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام، جوش ملیح آبادی کا ہے۔ اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ہیں۔''

کچھ اور قلم کاروں کا یہی نظریہ ہے لیکن اب تک شاید اس پر غور نہیں کیا گیا ہے کہ بڑی شاعری کیا ہے اور جوش کی شاعری میں وہ کون سی صفات ہیں جن کی بنا پر ان کو اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر مان لیا جائے۔

جہاں تک بڑی شاعری کے خدوخال متعین کرنے کا سوال ہے تو یہ ایک پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے تاہم مجموعی طور سے کچھ ایسی محکم صفات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں میں

اور خاص کر اردو فارسی شاعری میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے تناظر میں جوش کی شاعری کے اقدار پر غور کرنا بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ بلا شبہ اس صدی میں کم از کم ۱۹۵۵ء تک جوش، اردو شاعری کے افق پر سب سے زیادہ چمک دمک بلکہ دھمک اور ہنک والے شاعر بنے رہے اور اگر بیسویں صدی ۱۹۵۵ء ہی میں منجمد ہوگئی ہوتی تو شاید جوش کو اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لینے میں مطلق تکلف نہ ہوتا لیکن اس صدی کے نصف دوم میں اُردو ادب و شاعری میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں، رجحانات بدلے، فکر و نظر کے نئے زاویے قائم ہوئے، اعلام و رموز کی نئی جہتیں بروئے کار آئیں، اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا سخت مشکل ہوگا کہ اقبال کے بعد جوش ہی اس صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔

جوش کے عہد آفریں یا بڑے شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ ان کی شاعرانہ توانائی اور قدرتِ کلام سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکے۔ الفاظ اور تراکیب کا جیسا اور جتنا بڑا ذخیرہ جوش کے پاس تھا وہ نظیر اور انیس کو چھوڑ کر کسی دیگر شاعر کے پاس نہیں تھا اور وہ اس ذخیرے کو جس طرح چاہتے تھے، حاکمانہ قدرت کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے، لفظوں کے مینا بازار سجا سکتے تھے، سامعین کو حیرت زدہ بلکہ دہشت زدہ کر سکتے تھے، رومانی اور جمالیاتی شاعری سے داد و دہش کا انبار بٹور سکتے تھے مگر وہ جو شاعری کی اعلا ترین صفات ہوتی ہیں اور جو جمالیاتی حصولِ حظ کے ساتھ ساتھ کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں، جن میں گہری معنویت اور تہ داری ہوتی ہے اور جن کا اثر مدھم مگر دیرپا ہوتا ہے، ان صفات کا جوش کے یہاں بہت کم سراغ ملتا ہے۔

اس بات کو ایک دوسرے زاویۂ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سترھویں صدی میں وَلّی دکنی سب سے زیادہ اہم شاعر بن کر اُبھرتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میؔر، انیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبالؔ تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی شاعرانہ اور تخلیقی صفات ہیں جو ان چاروں شاعروں کو اپنی اپنی صدی کا سب سے عظیم شاعر بناتی ہیں۔ ان میں اگر کوئی قدرِ مشترک ہے تو وہ ان کی انسان دوستی، عام آدمیوں کے دکھ درد کا ادراک، اور انسانی زندگی کے جلال و جمال کی باز آفرینی ہے۔ یہ عناصر اوپری سطح پر چاہے کم نمایاں ہوں لیکن ان کی شاعری کے رگ و ریشے میں خون کی طرح دوڑتے نظر

آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ زمانہ کی گرد بھی ان کی شاعری پر اثر انداز نہ ہو سکی اور یہ شاعری آج بھی اتنی ہی سدا بہار اور دلکش ہے جتنی ان کے زمانے میں تھی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی آب وتاب اور زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ غور کیجیے تو تقریباً یہی عناصر فیضؔ کی شاعری میں بھی پیوست ہیں۔ ان کا دھیما انداز، انسانی دردمندی، مظلوموں کی حمایت، ایک خوشگوار مستقبل کی آرزو، عصرِ حاضر کے ظلم و جبر کے خلاف پرقوت احتجاج، دل میں ترازو ہو جانے والے ہلکے ہلکے نشتر، شاعری کا مستحکم جمالیاتی نظام، تہہ داری اور معنویت، ان کو میرؔ و غالبؔ دونوں سے قریب کر دیتی ہے۔ فیض کی شاعری گرماتی نہیں ہے، جوش وخروش نہیں پیدا کرتی، ذہن و دل کو صدمہ نہیں پہنچاتی، بلکہ ایک سچے رفیق اور دمساز کی طرح ہمارے فکری اور جمالیاتی احساسات کو متاثر کرتی ہے، تقویت پہنچاتی ہے اور فکر وخیال کو مہمیز کرتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد، سب سے بڑے شاعر ہونے کا تاج اگر کسی کے سر پر سجتا ہے تو وہ شاعر فیض احمد فیضؔ ہیں نہ کہ جوشؔ ملیح آبادی۔ کچھ لوگ میرا جیؔ یا ن۔م۔ راشدؔ کو فیضؔ سے بڑا شاعر قرار دینے پر مُصر ہیں لیکن یہ دراصل بر بنائے عقیدت ہے نہ کہ بر بنائے حقیقت۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑائی کا یہ ستارۂ امتیاز، پانچ دریاؤں کی زرخیز سرزمین کے حصے میں آیا ہے مگر یہ اُردو زبان کی زمینی وسعت کا ایک روشن استعارہ بھی ہے۔

جوشؔ کو شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے سب سے زیادہ انقلاب کے نعرے لگائے ہیں۔ شکستِ زنداں کا خواب، بغاوت، انقلاب، غدّار سے خطاب، بھوکا ہندوستان، مردِ انقلاب کی آواز، وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام، ترانۂ آزادئ وطن، دعوتِ انقلاب جیسی پُر شور نظموں کی گونج کسی زمانے میں پورے ہندوستان میں سنائی دیتی تھی جن میں ان کا خطابیہ لہجہ اور بلند آہنگ سننے والوں کو جوش وخروش سے بھر دیتا تھا۔ اس زمانے کے سیاسی ماحول میں اس بلند آہنگی کی ضرورت بھی تھی لیکن اب یہ نظمیں از کار رفتہ معلوم ہوتی ہیں اور محض تاریخ کے ایک حصے کی خانہ پُری کرتی ہیں۔ شاعرِ شباب وہ اس لئے ہیں کہ حسن و جوانی کے بارے میں ان کی نظموں کی دلکشی اور رعنائی، نوجوان دلوں کی دھڑکن اور پختہ عمر کے لوگوں کے لئے جمالیاتی حظ کا وسیلہ بن جاتی تھی۔ فتنۂ خانقاہ، الھڑ کامنی، حسن مخمور، روپ متی، یہ کون اٹھا ہے شرماتا، یار پری چہرہ

اور سب سے بڑھ کر ان کی طویل نظم ''کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے'' نہ صرف جوش کی بے مثل قادر الکلامی اور اُن کی بے پناہ قوتِ بیان کا اشاریہ ہے بلکہ اس میں حظ و کیف کا ایسا عالم بھی ہے جو انسان کو بیخود کر سکتا ہے۔ مثال کیلئے اس نظم کا صرف ایک بند ہی کافی ہے:۔

اٹھا ہے سرِ بامِ حرم، دَیر کا طوفاں
پھر رقص میں ہے وہ صنم فتنۂ دوراں
غزنی میں پکار آؤ کہ پھر کفر ہے جولاں
مو باف کے لچھے میں لپیٹے ہوئے ایماں
اب آئے جسے حوصلۂ بُت شکنی ہے
کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے

موباف کے لچھے میں ایمان کے لپٹے ہونے کا منظر صرف جوش ہی دکھا سکتے تھے کیونکہ وہ جس جاگیر دارانہ ماحول کے پروردہ تھے، اس میں ان کا باریک مشاہدہ، حسن پرستی کا فطری رجحان اور پرُ جوش تخیل، اس قبیل کے محاکاتی اور جمالیاتی مصرعوں کی تخلیق بلا تکلف کر سکتا تھا۔ نازک اور لطیف تشبیہات کا ایک سیلِ رواں ہے جو پوری نظم پر اپنا پرتو ڈال رہا ہے لیکن تیرہ بندوں پر مشتمل اس طویل نظم میں اکھرے جمالیاتی کیف، تشبیہہ سازی اور قدرتِ کلام کے سوا اور کیا ہے جسے یاد رکھا جا سکے۔ اس کے مقابلے میں فیض کی نظم ''تمہارے حسن کے نام'' گہرے جمالیاتی احساس کے ساتھ ساتھ دردمندی اور دل سوزی کی ایسی فضا بھی تخلیق کرتی ہے، جس کا اثر دیرپا اور جس کا اُپروچ آفاقی ہے۔

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگر چہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام

سلام لکھتا ہے شاعر، تمہارے حسن کے نام

''گلبدنی'' کے تیرہ بندوں سے وہ کیف اور تاثر نہیں پیدا ہوتا جو فیض کی، دو بندوں کی، اس مختصر نظم سے از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جوشؔ نے صرف گلبدنی کی اکہری تعریف پر اکتفا کیا ہے جبکہ فیضؔ نے محض چند مصرعوں میں محبوب کے حسن کا بکھان کر کے، اس کو تلخیِ ایام کے شیریں بنانے کے عمل سے بھی جوڑ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نظم میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ، زمانے سے نباہ کرنے کے عمل کا ایک خوشگوار پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے اور اس کی معنویت زیادہ گہری اور اس کی فضا زیادہ تابناک ہو گئی ہے۔ جوش اکہرے تخیل کے شاعر ہیں اور قدرتِ کلام کے باوجود ان کی نظموں میں لمبائی تو ہوتی ہے مگر دبازت بہت کم یا بالکل نہیں ہوتی۔ فیض مختصر ترین الفاظ میں نظم کہتے ہیں مگر اس میں شدّتِ تاثر، معنویت اور گہرائی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

جوشؔ اور فیضؔ تقریباً ہمعصر تھے اور دونوں کو اپنی شاعرانہ تگ و دو کے لئے ایک ہی زمانہ ملا تھا اور ایک ہی سیاسی اور سماجی پس منظر میں دونوں نے اپنی تخلیقیت کا اظہار کیا ہے، اس لئے دونوں کے شاعرانہ سروکار کا تقابل بے محل نہیں ہے جبکہ جوشؔ اور فراقؔ یا جوشؔ اور مجازؔ کا مقابلہ کرنا بے محل بھی ہے اور غیر حقیقی بھی ہے۔

جوشؔ کی پوری شخصیت اور شاعری کو اگر مختصر ترین الفاظ کے کیپسول میں بند کرنا ہو تو صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ جاگیردارانہ مزاج اور ماحول کے اکمل ترین تہذیبی نمائندے تھے۔ ایک طرف انانیت، خودسری، خودپسندی، بغاوت طنطنہ اور دوسری طرف عورت اور فطرت سے گہری دلچسپی ان کی شخصیت اور شاعری کے ترکیبی عناصر تھے جسے آپ شعلہ و شبنم، سموم و صبا اور جنون و حکمت سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ اسی جاگیرداری طنطنے اور باغیانہ کردار نے ان کے اندر مصلحت اور موقع شناسی کے زمینی عناصر کو پنپنے نہیں دیا۔ غلط موقعوں پر صحیح بات کہنا اور اپنے اندرونی جذبات کو بے محابا زبان پر لے آنا، ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی جس نے ان کی ذاتی زندگی میں تلخ کامیوں کا زہر گھول دیا اور اس سے وہ تا دمِ آخر نجات نہ پا سکے۔ ہندوستان میں انھوں نے ٹیگور، اقبال، ابوالکلام آزاد کو تنقید کا نشانہ بنایا اور پاکستان میں ایوب خاں اور اسکندر مرزا جیسے ڈکٹیٹروں کو بھی نہیں بخشا۔ اب کوئی اس کو ان کی مردانگی کہے یا بھولا پن کہ جو دل میں وہی زبان پر، لیکن زمانہ اور سماج اس

جسارت کو کبھی معاف نہیں کرتا اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ جوش نے خاندان، حکومت یا خدا سے چاہے جتنی بغاوت کی ہو لیکن انھوں نے جاگیردارانہ نظام کے اس اسٹرکچر سے کبھی بغاوت نہیں کی جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔ طبقۂ اشراف کا جاگیردارانہ تصور ہمیشہ ان کی زندگی اور شاعری کا خاصہ بنا رہا۔ کمزوروں اور مظلوموں کے دُکھ درد سے ان کو کبھی کوئی نسبت نہیں رہی، نہ ذاتی سطح پر، نہ اجتماعی یا تصوراتی سطح پر۔ ان کی حسن و شباب سے متعلق نظمیں ہوں یا مظاہرِ فطرت کی مصوری، فکر و حکمت کی رباعیات ہوں یا طنزیہ شاعری، دبے کچلے لوگوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ان کی جاگیرداریت، عوام الناس کی فلاح کے بارے میں سوچ سکتی تھی اور نہ اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ مزدور عورتوں اور کسانوں کے بارے میں انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ سب ان کے رومانی تصورات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں گہری انسانی ہمدردی کے جذبے کا سراغ کہیں دور دور تک نہیں ملتا۔ جوش کے مقابلے میں فیض کے یہاں ایسے مقاماتِ آہ و فغاں کی بہتات ہے جہاں شاعر کا دل، مظلوموں کی آوازِ شکستِ دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے اور اپنی نرم و لطیف و خوشگوار آواز میں ان کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھتا ہے۔

سیاسی لیڈر کے نام، مرے ہمدم مرے دوست، اے دلِ بیتاب ٹھہر، شورشِ بربط و نے، ترانہ، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، سوچ، ملاقات، دریچہ، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور اس قبیل کی متعدد نظموں میں غمخواری اور گہری انسانی ہمدردی کی موجِ تہہ نشیں نے فیض کی شاعری میں ایسا رنگ و آہنگ بھر دیا ہے جو محض تاریخ کے صفحات کی زینت بن کر نہیں رہ جائے گا بلکہ غالبؔ کی شاعری کی طرح، آئندہ زمانوں میں بھی چراغِ راہ ثابت ہوگا۔

میرؔ و غالبؔ کی شاعری میں جو انسانی سروکار ہے، جو حیات بخش عناصر ہیں اور جو آج کے انسان اور آج کے دور سے مکالمہ کرتے ہیں، وہی عناصر دوسری صورتوں میں فیض کے یہاں بھی موجود ہیں جو آئندہ صدیوں کے انسان سے بھی مکالمہ کرتے رہیں گے لیکن جوش کی شاعری میں بنی نوعِ انسان سے دور تک مکالمہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہے اسی لئے وہ بہت اہم اور بہت پُرقوت شاعری ہوتے ہوئے بھی بہت پائدار اور دوررس نظر نہیں آتی۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی کی شاعری بہ حیثیت شاعر، توانا اور طاقتور ضرور ہے مگر اس کے اثرات محدود ہیں اور یہ نقادوں اور دانشوروں کے

احاطۂ فکر ونظر سے آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ عام انسان سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔اس کے عوامی سروکار کی حیثیت معدوم ہے۔اس لئے اس کا حاصل بھی معلوم ہے۔فکر اور تخیل جب تک جذبہ نہ بن جائے، شاعری میں آب وتاب مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔بقول پروفیسر مسعود حسین خاں:

''اعلیٰ شاعری نقالی ہے اور نہ تخیل کی کشیدہ کاری۔ یہ حرف وصوت میں رقصِ حیات ہے۔اس رقص میں نقل اور اصل، سرخوشی اور فنی خم وپیچ سب کا اپنا اپنا مقام ہے، لیکن اس میں تحریک، یقیناً حیات کی برقی رووں سے آتی ہے۔جن سے سرشتِ انسانی عبارت ہے، وہی جانِ شاعری ہیں، باقی چیزیں اضافی اور آرائشی ہیں۔''

(جوش ملیح آبادی۔تنقیدی جائزہ۔صفحہ۔۳۴)

جوش جس آزادی کے لئے برسوں اپنی پرشکوہ شاعری سے دیش واسیوں کے دلوں کو گرماتے رہے، جب وہ حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کی حیثیت ''داغ داغ اجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' سے کچھ زیادہ نہیں۔ جوش کو فطری طور سے اس ادھوری آزادی سے صدمہ پہنچا اور انھوں نے ''ماتم آزادی'' کے نام سے ۴۴ بندوں اور ۲۶۴ شعروں پر مشتمل اس کا مرثیہ لکھا جس میں حاصل شدہ آزادی کے بارے میں اپنے ردِعمل کا کھل کر اظہار کیا اور حاصل کا افسوس اور بے حاصلی کا ماتم کیا ؎

جب باغبانِ قوم ظفر مند ہوگیا
ہر برگِ نرم، خاک کا پیوند ہوگیا
عاشق جو وصل سے خرسند ہوگیا
فالج گرا دماغ پہ، دل بند ہوگیا
اُترا بخار، عقل کو طاعون ہوگیا
پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہوگیا

سروِ سہی نہ ساز، نہ سُنبل، نہ سبزہ زار
بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ برگ وبار
جیحوں، نہ جامِ جم، نہ جوانی، نہ جوئبار

گلشن، نہ گلبدن ، نہ گلابی، نہ گل غدا
اب بوئے گل، نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

باوجود اس حقیقت کے، کہ اس بند کا آخری مصرعہ ''وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ'' ضرب المثل بن گیا ہے، پوری نظم اپنی طویل القامتی کے باوصف ،فیض کی چار بندوں اور کل ۲۷ اشعار پر مشتمل نظم ''صبحِ آزادی'' کے مقابلے میں کافی کمزور معلوم ہوتی ہے۔فیض کہتے ہیں ۔

جگر کی آگ ، نظر کی امنگ، دل کی جلن . .
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کدھر سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیضؔ کی نظم ایجاز، اختصار اور ارتکاز کا خوبصورت نمونہ ہے جبکہ جوشؔ کی شاعری کو ان چیزوں سے اتنی بھی نسبت نہیں جتنی کہ کعبہ کو بتوں سے ہے۔ایک بات کو سو ڈھنگ سے کہنے پر قادر ہونا، شاعر کی مشاقی اور قدرتِ کلام کی دلیل تو ہے مگر یہ بڑی شاعری نہیں، کہ بڑی شاعری لفظوں کا اعجاز دکھاتی ہے۔ذخیرۂ الفاظ کی نمائش نہیں لگاتی ۔میر انیس ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن وہ مترادفات کا بازار نہیں سجاتے اور نہ کسی سطح پر لفظ و معنی کی معجزہ نمائی سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔جوش کی قادر الکلامی ہی دراصل ان کی خوبی بھی ہے اور یہی ان کی کمزوری بھی ہے کہ اس کی وجہ سے خیال کا ارتکاز نہیں ہونے پاتا اور وہ سیلِ الفاظ ہی کو تخلیقیت کی اصل جولاں گاہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔فیض کی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ خیال کی مرکزیت پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں، تفصیل کے بجائے لفظوں کے اعجاز سے سروکار رکھتے ہیں اور لفظ و معنی کے رشتوں کے استحکام پر اپنی پوری تخلیقی توانائی کھپا دیتے ہیں۔

بلا شبہ جوش اس عہد کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کے دامن کو وسعت دی ہے۔ اس کو طرزِ ادا کی نئی سمتوں سے روشناس کرایا ہے۔ مردانہ اور باغیانہ لہجہ دیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کے زخیرۂ الفاظ سے شاعری میں کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی رباعیات کا تو ہمعصر اردو شاعری میں جواب ہی نہیں ہے۔ فراق، رواں، جاں نثار اختر، سب کی رباعیات اپنی جگہ خوبصورت اور مستحکم ہونے کے باوصف، جوش کی رُباعیات کے مقابلے میں کمتر ٹھہرتی ہیں ۔

یاں چمپئی دھوپ ہے گلابی سایہ
رہتا ہے سحابِ ابدیّت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے عالمِ ارواح
آیا ! یارانِ رفتہ، آیا آیا!

ہر بات میں تیغِ خوں چکاں ہے یارب
ہر پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوں میں
انساں کی برادری کہاں ہے یارب

جوش نے شاعری کا ایک نیا انداز ایجاد کیا جس کے موجد و خاتم وہ خود ہی تھے لیکن ان کو بیسویں صدی میں اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر کہنا، قرینِ حقیقت نہیں معلوم ہوتا۔ ذاتی پسند کی بات اور ہے، اور یہ نقد و نظر سے پرے کی چیز ہے۔

☆☆☆

بقدر ذوق نگاہ

اقبال حیدر

ذہنِ انسانی کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تجاوز ہی ارتقاء کا محرک اوّل ہے۔ جتنے بھی بڑے لوگ آئے ہیں یا بڑے کام ہوتے ہیں ان کی ابتدا ہی مروجہ زندگی سے نا آسودگی اور عدم اطمنان سے ہی شروع ہوئی ہے۔ اس لئے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ تجاوز اور فروغ کا باعث ہوتے ہیں۔ انہیں قبل از فروغ کی خانہ بندی (Classification) سے جانچنا یا پرکھنے کی کوشش کرنا Counter productive ہوتا ہے۔ یہ تہذیب نظر فکری، سماجی، ادبی اور حتیٰ کہ مذہبی حوالوں سے بھی ایک مثبت اور بہتر مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس خیال کو مزید تقویت اس وقت ملتی ہے جب ہم زمانوں، معاشرتوں، ذہنوں اور نظاموں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں اور یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس قانونِ ارتقا کی قبولیت اور زوال پذیری اور زبوں حالی میں ایک یقینی نسبت معکوس پائی جاتی ہے۔ اسی تناظر میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اکثر معاشرے نشاۃ ثانیہ تو درکنار بسا اوقات اپنے ہونے کا جواز بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ جو عوامل اس تنزلی کا باعث بنتے ہیں اس میں جغرافیائی، لسانی، طبقاتی اور مذہبی اکائیوں کا غیر معمولی عدم تناسب سرِ فہرست ہے۔ اب چاہے وہ کسی دفعتاً انخلا کے نتیجے میں ہو یا اچانک Massive influx کے طور پر یعنی

Sudden forced or ill conceived change in demographic make up of a region

سے جو نزاعی صورتِ حال سامنے آتی ہے اس کا تدارک اگر منصفانہ طور پہ اور معروضیت کے ساتھ نہ

کیا جائے تو اقدار کی شکست وریخت کا عمل غیر فطری ہو جاتا ہے۔ اب مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تدراک کے مخالف عناصر کون سے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں تمام وہ قوتیں شامل ہوتی ہیں جن کا دال دلیا اور حلوہ مانڈ انصابِ موجود (Status) سے وابستہ ہوتا ہے اور کسی بھی قسم کی تبدیلی ان کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ ذہن سازی کا کوئی بھی منطقی یا معروضی عمل ایسی قوتوں کو نہیں بھاتا اس کے برعکس ذہن سازی کا یہی خودفراموشانہ عمل مثبت قوتوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ یقیناً ان مثبت اور ممد قوتوں میں ادیب اور شاعر بھی شامل ہوتے ہیں اصل میں تو تمام انقلابی سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان سے پیشتر ذہن سازی اور ماحول سازی کے عمل میں سب سے واضع کر دار ہمیشہ شاعر وادیب کا ہی رہا ہے۔ اس کردار کو نباہنے میں سب سے کڑی شرط یہی ہے کہ اس کے اسلوب کی لامحدودیت، ارفیت اور راخیت (Integrity) برقرار رہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ادیب مقبول اور ہر دل عزیز تو رہ جاتا ہے مگر منصب ارتقائیت سے نیچے آجاتا ہے یا پھر انتہائی زوال پذیر اور جانبدار معاشرے میں بالکل غیر مقبول ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں فائدہ منفی قوتوں کا ہوتا ہے اور Status Quo برقرار رہتا ہے۔ اب اگر ادب برائے ادب ہی کو اپنایا جائے تو پھر شاعر کی بلا سے کون بڑھے کون گھٹے۔ مگر اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ ساری کاوش لایعنی ہو جاتی ہے۔ اس سے ہٹ کر ادب برائے زندگی کو برتنے میں مقصدیت آجاتی ہے اور کتنے ہی ادیب ونقاد اسے ادبیت کے لئے غیر ضروری بلکہ مضر قرار دیتے ہیں۔ یہ دو بحثیں تو ایک زمانے سے چلی آرہی ہے اور شاید تادم زمانہ رہیں گی مگر کوئی نہ کوئی پیمانہ یا اصول تو وضع کرنا ہوگا۔ جو لوگ بھی اپنی تخلیقی، مذہبی، علمی یا منصبی حیثیت میں لوگوں کی فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی گراف تیار کیا جائے تو شاید نیچے سے اوپر جاتے ہوئے سب سے واضح فرق اجتماعی شعور (Collective Wisdom) کو چیلنج کرنے سے مختص ہوگا۔ ذہنوں کی آبیاری (Cultivation) کے لئے ضروری ہے کہ ان کے معتقاد کو منصب سوال پہ لایا جائے اور انکو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ پرکھنا مان لینے سے بدرجہا بہتر ہے۔ Dogmatic معاشرے میں ایسا کرنا اکثر بہت خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے لیکن یہ بھی زندگی ہی سکھاتی ہے کہ جو معاشرے اس عمل تطہیر سے نہیں گزرتے ان کا مقدر تنزلی اور انحطاط کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا۔ ہمارا معاشرہ یعنی برصغیر پاک وہند کا معاشرہ پچھلے

ڈیڑھ سو سال (۱۵۰) سے اسی جانکنی سے دوچار ہے۔ ہم پرانی اور نئی تہذیبوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے خلفشار کو Resolve نہیں کر پائے کیونکہ ہم نے ایک منافقانہ رویہ اپنائے رکھا۔ ہم میں کبھی اتنی تہذیبی معروضیت اور سکت پیدا ہی نہیں ہو سکی کہ ہم از سرِ نو ہر چیز کو پرکھنے پر آمادہ ہو پاتے۔ یہی نہیں ہم ایسی ہر کوشش اور فکر کو معطون کرتے چلے آئے ہیں یہاں تک کہ جن لوگوں کو ہم سراہتے بھی ہیں انکی بھی ہر اُس بات اور فکر کو فراموش کر دیتے ہیں جو ہمارے مخصوص رویے کے حق میں نہ ہوں۔ اس کی سب سے واضع اور زندہ مثال اقبال اور فکرِ اقبال ہے۔ ظاہر ہے جب فکر یہ مطابقت رکھنے والوں کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا جائے تو اختلافی فکر رکھنے والوں کا تو خدا ہی حافظ۔ جوش جو اس صدی کے دوسرے سب سے بڑے شاعر اور non-conformist تھے ان کو اس عصبیت نے بہت نقصان پہنچایا۔ ہم اپنے اس مضمون میں جوش کے حوالے سے بالخصوص چار عنوانات سے گفتگو کریں گے (۱) جوش فہمی کے مسائل (۲) شاعرِ انقلاب جوش (۳) جوش کے صوفیانہ رجحانات (۴) جوش کی ناگزیریت (Indispensabillity)۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر اقتباسات سے دانستہ گریز کیا جائیگا خصوصاً پہلے اور دوسرے ذیلی باب میں۔

جوش فہمی کے مسائل:

جوش فہمی کے سلسلے میں جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہی ان کی شاعری کا وصف اول بھی ہے یعنی فکری ابہام سے دوری۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ اگر آپ کے یہاں Clarity of Thought ہے اور آپ کو اظہار میں خصلتاً یا اسلوباً دشواری نہیں پیش آتی ہے تو آپ کی وضع کردہ (Territory) میں دورائے نہیں ہوگی یعنی آپ کو وہی لوگ پسند کریں گے جو آپ کے ضابطہ تخلیل (Thought Process) اور نظام اقدار Value System کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر فکری مواد کے لحاظ سے اپنے قارئین کی واضع اکثریت کے لئے غیر مانوس ہوں تو معاملہ اور گھمبیر ہو جاتا ہے۔ جوش کے سلسلے میں تو عام طور پر بوجوہ یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ گویا وہ ایک سنجیدہ فکر رکھتے ہی نہیں تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جوش نے جس مستقل مزاجی اور معروضیت سے فکری استقامت کو اردو

شاعری میں بحال کیا ہے اس کی مثال ڈاکٹر اقبال کے سوا کہیں نہیں ملتی۔اس کے علاوہ بھی چند امور ہیں جیسے جوش کی ۵۵ء کے بعد کی شاعری اور مجموعوں کی عدم اشاعت اور عدم دستیابی۔معاملہ تو یہاں تک بگڑ گیا ہے کہ ہمارے اکابرین نقد و انتقاد یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ انہوں نے جوش کے کلام کا خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔شاید ان تمام باتوں کی وجہ ہی سے تمام تنقیدی مضامین میں ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کی نقل نہیں تو سولت ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ایک پہلو جو اس سلسلے میں بہت اہم ہے اور اکثر بے جا مصلحتوں کی وجہ سے کھل کر زیر بحث نہیں آتا وہ جوش کے بارے میں چند بہت ہی مضر غلط فہمیاں ہیں۔اول یہ کہ انہیں اقبال کے مخالفوں میں شمار کیا جاتا ہے حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔یہ ضرور ہے کہ علامہ اقبال کی بہت سی فکری اور مذہبی ترجیحات پر معروضی اعتراضات کرنے والوں میں جوش اور فراق بہت نمایاں رہے لیکن کیا یہ بے چینی اور عدم اطمینان بھی اقبال کے تشکیل کردہ حرکی نظام کا منطقی نتیجہ نہیں ہے۔اقبال نے اگر کچھ بھی اور نہ کیا ہوتا اور صرف اس فکری جمود کو توڑ دیا ہوتا تو لائق صد احترام پاتے۔اب اگر ان کی تعمیر کی ہوئی ذہنی فضا میں نئے ابعاد نہ تلاش کیے جائیں تو تمام ترکیے دھرے پر پانی پھر جائیگا۔اس کے علاوہ بھی اگر دیکھا جائے تو اقبال نے اپنے تمام پیشروؤں پر، سقراط سے لیکر مارکس تک، کسی نہ کسی نہج سے اعتراض کیا تھا۔عام طور پر ان کے ایمان و اعتقادات اور تصور خدا کے حوالے سے۔اب اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اقبال ان لوگوں کے مخالف یا سرے سے لے کر قائل ہی نہیں تھے۔ظاہر ہے انہوں نے بھی اپنے تمام پیش روؤں سے فیض حاصل کیا تھا۔اس طرح جوش اگر اقبال پر کوئی اعتراض کرتے ہیں یا کبھی ان سے اپنا تقابل کرتے نظر آتے ہیں تو یہ تو عظمت اقبال کا کھلا اعتراف ہے۔لوی بھی جبلی طور پر بہر عظمت اپنے سے فوری پیشتر عظمت کا ثمرہ ہوتے ہوئے اس سے تجاوز کرنے کی بھی خواہاں ہوتی ہے۔یہ Self Assertation اور Self Actualization کے لئے لازمی ہے۔اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔بیٹا اگر باپ سے قد ناپے تو وہ باپ کی محبت یا اہمیت سے انحراف نہیں بلکہ اعتراف ہے۔اصل میں تفہیم اقبال اور تلاش اقبال کے سلسلے میں ادھر پچھلے چند سالوں سے جن اندیشوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا جواب بھی کم و بیش اسی نکتے میں مضمر ہے۔اب اقبال کی ایک رخی تعبیر اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگ اور کچھ ان سے منسوب کرنے پر

راضی بھی نہیں ہونگے کیونکہ اس سے ہماری جغرافیائی تشکیل اور نظریاتی اساس کو منسلک کر دیا گیا ہے۔اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر ہندوستان آزاد نہ ہوتا یا آزادی کے بعد جغرافیائی تشکیل قدرے مختلف ہوتی تو اقبال جیسے شش جہتی شاعر کی تعبیر کیا ہوتی۔ یہ بات پوری ذمے داری سے کہی جا سکتی ہے اگر اقبال کو ان تنگ نظر اور مفاد پرستانہ تعبیروں کے چنگل سے نکالنا ہے تو انکی ذہن سازی کے ثمرے میں پیدا ہونے والے فکری العادو جہات کا اعتراف کرنا ہوگا۔ظاہر ہے اقبال کی فکر حرکی مگر اثباتی تھی اور اثباتی فکر اپنی قدامت کی وجہ سے جامع اور مستقیم ہوتی ہے جبکہ غیر اثباتی فکر اپنی نوع میں نیم پختہ ہوتی ہے مگر معتقدات، محکمات، مفروضات، اخلاقیات اور ظنیات سب پر سوالیہ نشان لگاتی چلی جاتی ہے اور یوں تعمیر نو کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ جوش کوئی معمولی شاعر یا معمولی دماغ نہیں تھے۔انہوں نے کئی انتہائی اہم اور گہری کاٹ رکھنے والے سوال اٹھائے ہیں۔ اردو میں یہ دو ہی شاعر ہیں جنہوں نے منطقی استدلال کو لطیف تر شعری پیکر دے کر شعری امکانات کی لامحدودیت کو اعتبار بخشا ہے۔ جوش چونکہ اقبال کے بھی بعد تھے اور قدرت زبان بھی بے پناہ رکھتے تھے اس لئے انہوں نے تقریباً شعری امکانات کو تمام قیدو بند سے آزاد کرا دیا۔شاید ہی کوئی جذبہ یا محاکمہ ایسا ہو جس کو جوش نے محاسن شعری سے آراستہ نہ کیا ہو۔ جوش کو تج دینے سے شعری امکانات محدود، آزادیٔ فکر مجروح اور اقبال کی غیر فطری، غیر مفروضی اور جزوی تعبیر جڑ پکڑ گئی۔اس خانہ زنجیر کو بے صدا ہونے سے بچانا ہماری ضرورت ہے جوش کی نہیں۔

دوسرا رجحان یہ عام ہے کہ جوش پاکستان کے مخالف تھے۔اگر تقسیم اور آزادی ہند سے پہلے تک کا زمانہ دیکھا جائے تو ہاں جوش بھی اس خیال کے داعی تھے کہ غیر منقسم ہندوستان ہی ہندیوں کے لیے بہترین حل ہوگا۔ جوشؔ کے اس مسلک کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اکابرین میں تقریباً جتنے تقسیم کے حق میں تھے اتنے ہی اُس کے خلاف بھی تھے۔ دونوں طرف دلائل تھے۔ ابتک کی تاریخ نے کتنے خدشات کو صحیح اور کتنے ہی امکانات کو درست ثابت کیا ہے جب قومیں زمینی حقائق سے مجبور ہو کر مشکل فیصلے کرتی ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔مگر اس باب میں دو باتوں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ایک تو یہ کہ پاکستان اسرائیل کے علاوہ واحد ملک ہے جو جہاں بنا ہے وہاں آباد نہیں ہے۔دو قومی نظریے کی تشکیل سے لے کر پاکستان کے معرض وجود میں آجانے تک تمام تر کاوشوں کا

مرکز اور منبع بیشتر وہ علاقے تھے جو پاکستان میں شامل نہیں ہیں اور جن کو اس وقت بھی یہ معلوم تھا کہ وہ اکثریتی مسلم خطے نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ۱۹۴۷ میں سرحد بن جانے کے بعد دونوں طرف ایسے ہزاروں، لاکھوں مسلم افراد موجود تھے جو ایک موقف یا دوسرے موقف کے حامی تھے تو اگر اس نو تشکیل شدہ مملکت سے اگر اکھنڈ بھارت یا متحدہ ہندوستان کے حامیوں کو بے دخل نہیں کیا جا رہا تھا تو نو زائیدہ سرحد پار کر کے آنے والے کسی فرد کو اس بنا پر پاکستان مخالف نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ ایک تخلیکی عمل کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں رہتے ہوئے اسکی مختلف حکومتوں، منصوبوں یا پالیسیوں پر اعتراض کرنا بھی اکیلے جوش سے ہی مختص نہیں تھا۔ میں اس وقت صرحیاً جوش کی سنبل وسلاسل (۱۹۴۵) کی نظم وقت کی آواز کے اقتساب سے گریز کر رہا ہوں جس میں جوش نے کانگریس کو بڑی بہن بناتے ہوئے اس سے یہ کہا تھا کہ اگر چھوٹی بہن (مسلم لیگ) اپنا آنگن الگ کر رہی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ نظم تقسیم سے پہلے الہ آباد کے ایک جلسے میں جوش نے پڑھی بھی تھی۔ غرض کہ متحدہ اور غلام ہندوستان کی تحریک آزادی میں جن لوگوں نے حصہ لیا چاہے تقسیم کے حامی تھے یا مخالف ان کے ساتھ ان کے سابقہ میلانات کی بنیاد پر امتیازی سلوک ناروا ہے اور اگر کسی نے ایسی ٹھان ہی لی تو پھر بعد از تقسیم جغرافیائی محل وقوع اس پر لاگو نہیں ہو سکتا۔ ان سب باتوں سے قطع نظر جوش کا تصور وطن تھا جس کو وہ شعلہ شبنم (مطبوعہ ۱۹۶۶) کے ایک فٹ نوٹ میں بیان کر چکے تھے۔ نابغۂ روزگار لوگوں کے ساتھ تاریخ کے اہم موڑ پر پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے یہ کوئی ایسی انہونی یا قابل گرفت بات نہیں تھی۔ تاریخ میں متعدد بار ایسا ہوا ہے جب Common heritage میں دراڑیں پڑتی ہیں تو mixed emotions ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں فرانس اور برطانیہ کے قبضے میں والٹیئر، ولیم بلیک اور روسو کم وبیش اسی کشمکش کا شکار ہوئے مگر باوجود وقتی جذباتیت کے ان کے اس استحقاق کا اعتراف کیا گیا، ہمیں بھی کرنا چاہیے۔

شاعر انقلاب جوش:

اردو ادب میں کم ہی شاعر ہوں گے جنہوں نے جوش جیسی شہرت اور عظمت پائی۔ جوش جب ادبی افق پر نمودار ہوئے اس وقت اقبال کی شہرت وعظمت کا سورج نصف النہار پہ تھا۔ اقبال

جیسے نابغۂ روزگار اور ششں جہت مفکر شاعر کی موجودگی میں، اور انہی کے Domain میں اپنے آپ کو منوالینا ایک ایسا اعزاز ہے جو جوش کے علاوہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ عام طور پر ایسے منتہی کے بعد آنے والے اپنا راستہ اور اپنا اسلوب بالکل مختلف بناتے ہیں جیسا کہ جوش کے بعد آنے والوں کو کرنا پڑا۔ اسی دور میں جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان بنا چکے تھے اور اس حد تک کہ آج بھی اگر شاعر انقلاب کہا جائے تو پڑھے لکھے طبقے میں اس سے مراد جوش ہی ہونگے۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس (الٰہ آباد ۱۹۳۷) میں منشی پریم چند اور جوش نے صدارت کی اور ان کا ذہن ساز خطبہ آج بھی ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ جوش کے چراغ سے چراغ جلائے گئے اور پھر بدلے ہوئے حالات میں انکے تصور انقلاب کے حوالے سے بے تکے اعتراضات بھی کئے گئے اور ان کی شاعری یا فکر سے کچھ ایسے مطالبات کئے جانے لگے جو ان سے پہلے یا بعد کسی بھی شاعر سے نہیں کئے گئے۔ اعتراض کرنے والے مذہبی عناصر ہی نہیں تھے۔ ان میں بائیں بازو اور ترقی پسند گروہ کے افراد بھی شامل ہو گئے یہاں تک کہ فیض صاحب جیسا حلیم الطبع اور صلح جو آدمی جس نے کبھی کسی پر ایک منفی جملہ نہیں لکھا، جوش کے تصور انقلاب پر حاشیہ آرا ہو گیا۔ ممکن ہے یہ گذشتہ صدی کی پانچویں دھائی میں ان کی حیلی یا سیاسی ضرورت رہی ہو ورنہ فیض صاحب تو جوش کی عظمت کے ہمیشہ قائل رہے اور جوش کے انتقال کے وقت بھی جب انہوں نے ضیا الحق سے براہ راست جوش کے جنازے میں عدم شمولیت کی شکایت کی تو یہ کہہ کر کہ ضیا صاحب اب اس سے بڑا آدمی اس سرزمین میں دفن نہیں ہوگا۔ ان دورویوں کے تناظر میں ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ کیا جوش واقعی شاعر انقلاب تھے۔ ظاہر ہے اس سے پیشتر ہمیں انقلاب کی تعریف کرنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ جوش کس حد تک اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ حکماء نے انقلاب کی تعریف معروضی اعتبار سے کچھ یوں کی ہے کہ ذہنی، سماجی، معاشی، طبقاتی اور مذہبی رویوں میں گرانقدر تغیر پیدا کرنے والی شعوری کوشش اور اجتماعی کاوش کی طرف لے جانے والی حرکی ترغیب۔ اس انقلاب کی کامیابی اور ناکامی کا ہدف ہر معاشرے اور زمینی حقیقتوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے مگر اکثر سیاسی اور سماجی دانشور (Ideologues) سے جامد اور ارضیت سے مبرا مکتبی انقلاب بنا کر خود انقلاب مخالف قوت (Counter Revolution) بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تغیراتی اکائیاں آپس میں برسر پیکار ہو کر اپنی افادیت کھو بیٹھی ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ اکثر کامیاب انقلاب محض آزادی کے پیغام اور بنیادی اقدار کی بحالی کی بنیاد پر امر ہو گئے ہیں۔ جوش کا تصور انقلاب اس لحاظ بہت سادہ اور جذبے کی سچائی پر مبنی تھا۔ جوش کا انقلاب ان کے آس پاس کی زندگی سے پھوٹا تھا۔ اس کا سرچشمہ جیتی جاگتی زندگی تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی پابندیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ یہ پابندیاں معاشی، مذہبی، موروثی، فکری، طبقاتی اور علاقائی شکل میں انسان کو جکڑے ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے جب آپ اتنے سارے محاذوں پر نبرد آزمائی کریں گے تو بے شمار لوگوں کا ہدف بھی بنیں گے۔ جوش کے یہاں روح ادب سے لے کر محراب و مضراب تک ایک ایسی سرشارانہ جستجو ملتی ہے وہ کبھی بھی اس بات سے خائف نظر نہیں آتے کہ اس جستجو کا انجام کار کیا ہوگا۔ اگر شروع شروع میں ان کے لیے کعبہ و بت خانہ سنگ رہ مقصد تھے تو آخر میں بھی انہیں پردۂ تحقیق کے ہٹانے پر ہی اسرار رہا۔ جیسے جیسے ہمارے معاشرے میں سکت گیری آتی گئی اور روشن خیالی کے لئے حالات نا مساعد ہوتے گئے ویسے ویسے جوش کو پس پشت ڈالنے کی سازش زور پکڑتی گئی ادھر جوش نئے امکانات کھوجتے اور نئی تعبیریں سوچتے رہے لوگوں کو شرح صدر پہ اکساتے اور ذہنوں کو رواداری اور درگزر کی طرف بلاتے رہے۔ جوش کا انقلاب ایک Visionary کا انقلاب تھا اقبال کا انقلاب بھی ایک Visionary کا انقلاب تھا مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال نے اپنے فکری نظام کو ایک بہت بڑے نظام سے متصل کر کے اپنے تغیر میں ثبات ڈھونڈ لیا تھا۔ جوش اپنی جبلی آزادی اور عقلی خود مختاری کی بیناد پر ایسا نہیں کر سکتے تھے ان کا انقلاب زندگی کی طرح لامتناہی (Ongoing) تھا جس سے لا محالہ یہ تاثر قائم کیا گیا کہ بعد از انقلاب ان کے پاس کوئی نظام فکر نہیں ہے اور شاید ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ ارتقاء کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ہر انقلاب کے بعد زندگی اپنی بدیہی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور جاری رہتی ہے۔ جہاں تک ان دانشوروں کا تعلق ہے جو اپنی Ideology (نظریاتی نہج) کی وجہ سے جوش سے دل برداشتہ ہو گئے انہیں اول تو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ ایک Visionary کے انقلاب میں اور ایک معشیت داں کے انقلاب میں بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک پیش خیمہ ہوتا ہے اور دوسرا لازمہ، ایک علت ہوتا ہے اور دوسرا معلول یوں بھی جو انسان اپنے آباؤ اجداد کے مذہبی رجحانات سے روگردانی کر سکتا ہے اس سے کسی ازم پر کاربند رہنے کی توقع کرنا بالکل ہی ایسے ہے جیسے دریا سے تنگنائے ظرف کی شکایت کرنے

والے کوتالاب میں سمجھایا جائے۔ کاش ہمارے نظریاتی جدوجہد کرنے والے بے لوث اکابرین نے اس طرف بھی توجہ دی ہوتی کہ ہمارے تصور انقلاب میں ارضیت کی کمی کی وجہ سے بھی ہمارا انقلابی سلسلہ بارآور نہیں ہونے پاتا۔ جو انقلاب زمین سے پھوٹتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے کیونکہ اس کے سرکردہ عوامل کی جڑیں زمیں میں ہوتی ہیں اور وہ اپنے ماحول سے راسخ (Integral) ہوتا ہے۔ جوش صحیح معنوں میں شاعرِ انقلاب تھے وہ برصغیر پاک و ہند کی فضاؤں میں انقلابی روح دوڑا دینے والے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ اگر مختلف حیلوں بہانوں سے ان کے خلاف تقسیم ملک کے خلاف مجرمانہ بے اعتنائی نہ برتی گئی ہوتی خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جو انقلاب کے لئے کوشاں تو تھے مگر درآمد شدہ انقلاب ہی کے منتظر رہے تو آج ہماری تاریخ قدرے مختلف ہوتی۔ جوش، ناظم حکمت، پاپلونرودا، پشکن، اور ٹالستائی سب اپنی زمین ہی سے اخذ کرتے ہیں اور اسی کو لوٹاتے ہیں۔ ان کے مسائل اور Responses باطنی (Intrinsic) ہیں۔ یوں بھی جوش کا محورِ فکر محض مادی عدم مساوات نہیں تھا۔ وہ ان عوامل سے برسرِ پیکار رہے جو سماج اور فرد دونوں کے سوچنے کے انداز متعین اور متغیر کرتے ہیں۔ جوش نے عقل پسندی کا محض دعویٰ ہی نہیں کیا اس کو برتا بھی ہے۔ آخری سانس تک اس پر کاربند رہے۔ یہ بات پوری دیانتداری اور ذمے داری سے کہی جا سکتی ہے کہ جوش سے بڑا Rationalist اردو ادب میں نہیں ہے۔

متاعِ کفر ملے، یا سعادتِ ایماں
جلاؤ مشعلِ تحقیق ہر چہ باداباد

جوش اور صوفیانہ رجحانات:

عام طور پر اگر یہ کہا جائے کہ جوش کے یہاں صوفیانہ رجحانات بھی پائے جاتے ہیں تو لوگ عالمِ استعجاب میں آجائیں گے۔ اصل میں صوفیانہ رجحانات کے لئے جذبہ عشق اور وہ بھی ایک مخصوص زاویہ سے لازمی قرار پاتا ہے اور جوش عشق کی سرداری کے قائل ہی نہیں نظر آتے اور وہ عشق کو اعصاب کی اینٹھن سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ذرا ہٹ کے اگر گفتگو کی جائے تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام صوفیاء کی سب سے بے لوث اور کل وقتی سرشاری جو تھی وہ خدا کی جستجو تھی اور اسی جستجو کی Burning Desire کو عشقِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا مگر پھر وہی عشق آ گیا۔ اب ہم اگر ناموں میں

نہ الجھیں اور صرف کیفیت پہ جائیں تو شروع سے آخر تک جوش کے روئیں روئیں میں خدا کو پانے کی خواہش موجزن ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ (Personified) مجسم خدا کو رگیدتے ہوئے Overboard چلے جاتے ہیں تب بھی اس جذبے کی شدت اپنے معکوس انداز میں قائم رہتی ہے۔ روح ادب سے جو سفر روایتی صوفیانہ خیالات و رجحانات کے ساتھ شروع ہوا تھا اس نے الہام و افکار اور نجوم و جواہر تک آتے آتے ایک بہت ہی دلچسپ اور نایاب شکل اختیار کر لی۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میں سے کچھ روح ادب سے ہیں کچھ دوسرے مجموعوں سے۔

فنا ہو جا جھلک اٹھے گا سینہ شمع عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ غافل داغ ہستی ہے (روح ادب)

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے (روح ادب)

یا

یہ صوتِ سرمدی ہے جس پہ تارے رقص کرتے ہیں
یہ حسنِ دوست ہے جس کی تڑپ ہے ماہ کامل میں
جب آدھی رات پردہ ڈال دیتی ہے زمانے پر
کوئی دربار کرتا ہے مرے کاشانۂ دل میں (روح ادب)

یا

بنا دیں گے یقیں ہے جوش مردِ باخدا اک دن
تپش اندوز یاں سینے میں برق سوز پنہاں کی (روح ادب)

یا

اس قدر ڈوبا ہوا دل درد کی لذت میں ہے
تیرا عاشق انجمن ہی کیوں نہ ہو خلوت میں ہے
اس کا اک ادنیٰ کرشمہ روح وہ اتنا عجیب
عقل استعجاب میں ہے فلسفہ حیرت میں ہے (روح ادب)

روح ادب سے اتنے اقتباسات اس لئے لیے گئے ہیں کہ جوش کے شروع کے رجحانات کا اندازہ ہو جائے گا اور آگے چل کر ان کی فکر کے احاطے میں مدد ملے گی۔ اس گفتگو سے ہرگز یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی ہے کہ جوش خدانخواستہ مذہبی یا صوفیانہ رجحان کے حامل رہے اور نہ ہی یہ کوئی احسن قدم ہوگا۔ جوش کی سب سے بڑی خوبی ہی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سفر میں رہے انتہائی بے تکان فکری سفر۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک Supreme Being کا تصور ان کے یہاں ہمیشہ ایک محوری نقطہ (Pivotal Point) رہا ہے۔ وہ گھوم پھر کے اسی موضوع پر آتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے جوش صاحب سے خورشید علی خاں صاحب کی موجودگی (۱۹۷۵) میں عرض کیا کہ آپ کا مورخ جب بھی آپ کا فکری احاطہ کریگا تو آپ کو مذہبی یا مذہبیانہ شاعروں کے حلقے میں رکھے گا۔ جوش صاحب مستعجب ہوئے اور مجھ سے اپنی بات کی وضاحت چاہی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خدا یا مذہبی تصور خدا کے موضوع سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ پاتے۔ آپ کا موضوع کلام وہی ہوتا ہے چاہے اس کے اختلاف کی صورت میں ہو، کشمکش کی حالت میں ہو، کسی مخصوص تصور کا تمسخر ہو یا طنز ہو۔ یہ موضوع آپ کے یہاں جیسے ایک Un-resolved Truth ہے۔ خورشید علی خاں صاحب نے میری تائید کی اور جوش صاحب بھی کسی حد تک میرے جواب سے مطمئن نظر آئے۔ یہ واقعہ میں نے اس لئے نقل کیا کہ میں جوش کی اس فکری نہج کے بارے میں اپنے زاویۂ نگاہ کی عمر بتا سکوں اور جوش صاحب کے تہذیب نظر (جس کا بہت قائل ہوں) کا اعادہ کرسکوں کہ انہوں نے کس فراخدلی سے ایک بظاہر اختلافی نکتے کو ایک انتہائی نو آموز سے سننا قبول کیا۔ اب اپنے موضوع پہ واپس جاتے ہوئے اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ عرض کروں کہ اگر صوفیانہ خیالات کو خدا سپردگی یا خدا کی جستجو یا تلاش مان لیا جائے۔ فکرِ جوش کے طالب علم کو یہ ماننے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہوگا کہ ان کے یہاں اس میلان سے ایک قریبی رابطہ تھا۔ اس بارے میں جو بات سب سے دلچسپ ہے اور اس عنوان کو قائم کرنے کا کم وبیش مقصد بھی وہ جوش کا مخصوص اور تقریباً ٹریڈ مارک زاویۂ نظر ہے۔ جوش اتنے منفرد ذہنی ساخت رکھتے تھے کہ جس عنوان کو بھی لیا اس پہ اپنا ایک انمٹ نقش ثبت کیا، اس سے اتفاق یا اختلاف ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اس تمہید کے بعد نجوم و جواہر کی رباعیات سے قطع نظر کرتے ہوئے الہام و افکار سے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ان کا ایک مصرعہ جو ایک لحاظ سے

ان کا مرکزی خیال بھی ہے:

غرض ہے علم سے اے جوش بہت ملے کہ خدا

اسی جان لینے کی دھن میں وہ ہر سمت جاتے ہیں اور بلا شبہ اس عمل سے بہت سے سوال اٹھائے ہیں اور اپنی فکر کے بارے میں ڈھیروں سوالات کو جنم بھی دیتے ہیں۔ اوہ خود عالم استعجاب میں ہیں اور اپنے قاری اور ناقد کو بھی بار بار مستعجب کرتے رہتے ہیں۔ کبھی جبر کے قائل معلوم ہوتے ہیں تو کبھی اختیار کے، کبھی محض متشخص خدا کے انکاری معلوم ہوتے تو کبھی بشر کو الوہیت دینے کے حامی۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید ان کے یہاں کوئی جامع فکر نہیں تھی جو ہرگز صحیح نہیں ہے۔، ان کی فکر پر کھنے اور جانچنے پر مصر تھی۔ جیسا کہ اوپر کے مصرعہ میں بیان کیا گیا ہے مگر اس پہ مستزاد یہ کہ ان کی شاعرانہ دیانت اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ خیال کو اس طرح بیان کریں جس طرح ان کے ذہن پہ وارد ہوا ہو۔ یعنی the Analysis During جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ بھی مواد موجود ہے۔ اس طرح ایک طرف تو شعری میڈیم مالا مال ہوتا ہے دوسری طرف فکری منظر نامہ۔ اب دیکھئے اپنی نظم عروج انسانی میں جوش کی فکر کیا ہے:

عجب نہیں کہ بنے ایک روز نغمۂ قم
مری صدائے سلام علیکم اہل قبور
عجب نہیں کہ سر بزم وحدت مطلق
زبانِ حق پہ ہو اب نعرۂ انا المنصور
عجب نہیں کہ یہ ہیجان آرزوئے جمال
در کلیم کو خود کھٹکھٹائے داور، طور
عجب نہیں کہ اٹھا لے رباب کن ایک روز
یہ عبد بے سروساماں یہ بندۂ مجبور

یا آدمی نامے میں کہتے ہیں:

آدمی آہنگ بارو نغمہ خواں
آدمی ہے خاک کے منہ میں زباں

دہر کو جن قوتوں پہ ناز ہے
سب ہیں گونگی آدمی آواز ہے
آدمی ہے ممکن واجب حشم
مشعل پروانۂ دیر و حرم
آدمی کی سانس کعبے کا غلاف
آدمی کے گرد حق گرم طواف
درمیان تحت وفوق و بحر وبر
بس ہے ایک انسان جنس معتبر
آدمی مہسار زن، قطب یقین
آدمی پروردگار کفر ودیں
آدمی دانائے اسباب و علل
فاتح مستقبل و دیو اجل

یہ خیالات ہرگز غیر منطقی نہیں ہیں کیونکہ جب ہمیں اس سارے کھیل کا نہ آغاز معلوم ہے نہ انجام تو کچھ بھی ممکن ہے۔ انسانی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ انسان ایک دن ان چیزوں پہ بھی قدرت حاصل کرلے جن پر ابھی اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان امور میں سب سے اہم اور ناقابل یقین تسخیر موت ہے۔ مگر یہ خیال جوش کے یہاں اور صرف جوش ہی کے یہاں بار بار آتا ہے کہ اگر انسان موت پر قابو پالے تو تصور خدا کا کیا بنے گا۔ اب اسے آپ عقیدے سے یا منطقی اعتبار سے رد کردیں مگر کم از کم یہ Credit تو جوش کو دیں کہ ایک ایسی Far Fetched ہاپو تھیس نہ صرف ان کے ذہن میں آئی بلکہ ان کو اسے تمام تر شعری محاسن کے ساتھ کہنے کی تخلیقی قوت اور بلاخوف تردید وتعزیر بیان کردینے کی ہمت بھی تھی۔ اسی طرح جوش نے اس امکان کو بھی برتا ہے کہ ہوسکتا ہے خدا ہو اور بالکل اسی طرح ہو جیسا مذاہب کہتے ہیں اور اپنے حواس کی محدودیت (Shortcomings) کی وجہ سے ادراک نہ کرپارہے ہوں۔ بہت پرانا شعر ہے انکا:

اک قادر مطلق بہ اوصاف حسن

ہونا بھی عجیب اور نہ ہونا بھی عجیب

یا نجوم و جواہر کی بے مثل رباعی:

اک طرفہ کشاکش میں گھرا ہوں معبود
مکار حواس اور وہ بھی محدود
بالفرض اگر کشفِ خطا بھی ہو جائے
پھر بھی نہ یقیں آئے کہ تو ہے موجود

یا اک اور پرانا شعر

دریائے معرفت کا ملتا نہیں کنارا
اے فکر دستگیری اے شاعری سہارا

اسی طرح ان کے اجزائے فکر میں بے شمار حوالے خالصتاً روایتی تصوف کے بھی مل جائیں گے جیسے:

میں کثرت ظہور سے نادیدنی ہوں جوش
میں شدت وجود سے نا آفریدہ ہوں

یا

کسی خلائے نظر کے بھرنے کو
یہ زمیں آسماں ہیں کیا معلوم
ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اور پھر منقبت کا شعر

روئے خرد پہ صبح کی سرخی عیاں ہوئی
یہ آئے تو حریم نظر میں اذاں ہوئی

اس کے علاوہ احترام آدمیت کی فکر کو عمودی رفعت دیتے ہوئے جب جوش اللہ و عباد کو نکتہ اتصال پر لے آتے ہیں تو اس میں کوئی منطقی دشواری نہیں نظر آتی کیونکہ ان کی فکر جس غیر مشخص خدا کی اکثر قائل نظر آتی ہے۔ وہ مزاج، نفسیات اور صفات رکھنے والا خدا نہیں وہ تو صرف ایک ایسی توانائی ہے جو تمام

کائناتوں پر دسترس رکھتی ہے اور کفالت کرتی ہے۔ یہ ہی تصور جوش اور دیگر مفکروں کے یہاں حق اور خدا کو Absolute اور Relative یا قدیم اور حادث سے بالترتیب مختص کرتا ہے۔ اس باب میں بھی جوش مسلسل عقلی جواز پر اصرار کرتے ہیں اور کسی حد تک Resolve کرتے ہیں اور بہت پر امید نظر آتے ہیں۔

دیارِ حق کے تجس میں ہے دلِ باطل
نسیم امن کے جادے پہ ہے سموم فساد
چھڑے ہوئے ترانے وفاق و وحدت کے
میانِ عالمِ ارواح و عالمِ اجساد
خوشا کہ جوش وہ دور عظیم دور نہیں
جب ایک موڑ پہ مل جائینگے الٰہ و عباد

حتیٰ کہ جب وہ اتنا سب کھنگا لنے اور کہہ چکنے کے باوجود اپنے آخری مجموعے محراب و مضراب میں ایک ایسا شعر بھی کہتے ہیں جس پر صاحبانِ طریقت جھوم جھوم اٹھیں مگر ان کی مراد اسی تصور سے ہے:

بَدل ربودگی وجہ رب ذوالا کرام
کوئی جمال نہیں ہے بقدر ذوق نگاہ

جوش کی ناگزیریت (Indispensibility):

ایک پیمانہ تو پائندگی ناپنے کا کسی شے یا شخص کا اس کی نا ساعدگی کے باوجود ڈٹے رہنے یا قائم رہنے کا ہے کیونکہ Longevity خود وجود پہ دلالت کرتی ہے دوسرا اس کی Relevence سے متعلق ہے۔ ان دونوں لحاظ سے جوش کی حیثیت مسلم ہے۔

پچھلے تیس سال سے خصوصاً اور تقریباً پچاس سال سے عموماً جوش کے لئے حالات انتہائی نا ساعد بنا دیئے گئے۔ ایک طرف باہمی ستائش کے حوالے سے دل جوئی (Peer Pressure) اور دانشورانہ دھونس (Intellectual Intimidiation) کے ذریعے جو Lobbying کا کلچر بنا، اس نے اندھا بانٹے ریوڑیاں کا ساسماں بنا دیا۔ دوسری طرف انفارمیشن ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا کے

فروغ پانے سے لمحاتی اضطراریت نے جنم لیا۔اب تحریر کی جگہ تقریر نے لے لی اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو اور گمراہ کن پروپیگنڈا کرنا بہت آسان ہوگیا۔اس کے علاوہ ان اداروں پہ قابض ہونے والے جس کو بھی چاہیں منظرنامے سے منہا کر سکتے ہیں۔تعریف وتنقیص کا تو پھر بھی سدِ باب کیا جا سکتا ہے مگر سارے فسانے میں ذکر ہی نہ ہوتو ہلاکت لازمی ہو جاتی ہے۔ جوش کے ساتھ یہ تمام معاندانہ رش رکھی گئی اور اس کے باوجود اب ہندوستان پاکستان اور دیگر مما لک میں جوش کا احیاء ہو رہا ہے۔

دوسری بات Relevance کے حوالے سے ہے کیونکہ حالات اور ذہن نہیں بدلے اس لئے تین چوتھائی صدی یا نصب صدی گزر جانے کے باوجود جوش اور اقبال کی صدا آج بھی اتنی ہی مطابقت لئے ہوئے ہیں۔کاش ہمارے فکری تجاوزات اور ذہنی فروغ نے انہیں Irrelevant بنادیا ہوتا۔

جوش اس لئے ناگزیر ہیں کیونکہ ہمیں سرسید، شبلی، حالی، غالب، نظیر، میر، حسرت، اور اقبال کی فکر کو ایک Panoramic view میں دیکھنا ہے۔روشن خیالی، انسان دوستی، رواداری، حسن سلوک اور اخلاقیات پر زور دینا ہے۔اپنی بقا کیلئے عقل کی طرف مراجعت کرنی ہے۔

جوش اس لئے بھی ناگزیر ہیں کہ شعری امکانات کا جو ہوشربا ویژن انہوں نے دیا تھا اور جس محسوساتی تعقل (Sensuous Rationality) سے اردو کے حسیاتی نظام کو جلا بخشی۔اس کے استفادے ہی میں اس زبان وادب کی بقا مضمر ہے۔

جوش اس لئے بھی ناگزیر ہیں کہ ان کے بعد آنے والوں نے اپنے منصبی فرائض سے منہ موڑ کر زندگی رقم کرنے سے گریز کیا اور اگر کبھی بنیادی خرابیوں کی نشاندہی بھی کی تو اس ایمائیت اور احتیاط کے ساتھ کہ استعماری نسب نامہ نہ برہم ہونے پائے۔گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

پسماندہ، کم ترقی یافتہ اور زبوں حال معاشرے کا ادب انقلاب کا بانی اور محرک ہوتا ہے۔ ہمارا بھی ہوا کرتا تھا اب پچھلے چالیس پینتالیس سال کا ادب محرک تو کیا معاون بھی نہیں ہو پایا۔ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی اور معاشرے کے دیگر شعبوں میں Convent پڑھا ہوا، نمائندہ مسائل سے بے خبر اور بے حس اشرافیہ کا ایک طبقہ اس ملک میں ہر مثبت اور بہتر Change کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔اسی طرح ہمارا ادب بھی اسی اشرافیہ کا حصہ اور اسی کے حسب مذاق بن گیا ہے۔ یہ شاید

اس لئے بھی ہوا کہ ہمارا شاعر اپنی بیشتر آبادی سے (مرد وزن کے تعلقات کے علاوہ) بہت ہی کم حسی تجربے میں شریک ہے۔ جیسے ہمارے نظریاتی رسائش (Ideologies) اور بنیاد پرست مولوی یکساں کسی بیرونی نظام حیات سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی ہمارا شاعر اور ادیب بھی سماج اور عوامل بود و باش سے کٹ کر محض تنقیدی رویوں کے مغربی ماخوذات کے لئے شعر کہہ رہا ہے۔ سماج کی نفسیات (Psyche) کو جھنجوڑنے کے لئے جو برہنہ گفتاری اور (کبھی کبھار دیدہ وَنی) درکار ہوتی ہے۔ اور جو ہر عظیم ادب کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اس سے کنارہ کشی کی جو داغ بیل ڈالی گئی تھی وہ اب اردو ادب سے اس کے وجود جواز چھیننے کے پے در پے ہے۔ ادب حظ رسانی سے ماوراا گر کوئی چیز ہے تو اسے اس یک لہجائی (Monotone) نرم گفتاری سے اپنے آپ کو نکالنا ہوگا۔ موضوع، مسائل، اور زندگی کی گھمبیرتا اور شش جہتی، ایک کثیر الجہات اسلوب کی متقاضی ہے جو زندگی کے تمام رنگوں کی عکاسی کر سکے۔ جوش آج بھی اس شاعر فردا کے منتظر ہیں جس کے لئے انہوں نے کہا تھا:

فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

☆☆☆

جوشؔ کی دو نظموں کے نسائی کردار اور ان کی معنویت

ڈاکٹر نفیس بانو

جوشؔ اپنے عہد کی توانا آواز ہیں۔ ان کے چاہنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے معترضین اور مخالفین کی بھی کمی نہ تھی۔ جوشؔ کبھی لفظ کے جادوگر کہے گئے تو کبھی انھیں محض لفظ کا بازیگر کہا گیا۔ کسی نے ان کی انقلابیت پر اصرار کیا تو کسی نے ان کی رومانیت پر زور دیا، کسی نے ان کی زبان و بیان کی خامیاں گنوائیں تو کسی نے ان کی قادرالکلامی کا لوہا مانا۔ کسی نے کہا کہ ان کی شاعری دیر تک اور دور تک ہمارا ساتھ نہ دے سکے گی تو کسی نے ان کی شاعرانہ عظمت کو جھک جھک کر سلام کیا۔ عرض کبھی ان کی شخصیت اور کبھی ان کا فن دونوں اعتراضات کی زد پر رہے۔ مگر یہ شاعر مجاہد ہمیشہ سینہ تانے کارزار شعروادب میں اس طرح ڈٹا رہا کہ اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ جوشؔ کی شاعری میں جہاں تند و ترش انقلابی اور احتجاجی رنگ ہے وہیں حسن و شباب کی نیرنگیاں بھی اپنے شباب پر ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ موجودہ عہد میں ان کی معنویت باقی ہے یا وقت کے گرد وغبار میں دب کر رہ گئی۔ فطرت اور عورت دونوں کا حسن انھیں اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ تانیثی موضوعات پر ان کے یہاں کئی نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں جوشؔ کبھی مخلصانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی ناصحانہ انداز اپناتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے یہاں عورت سے متعلق اکثر روایتی اور فرسودہ خیالات بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'خاتون مغرب' کے وہ حصے دیکھے جاسکتے ہیں جن میں عورت کے

لئے عصری تعلیم کو غیر ضروری کہا گیا ہے، عصر حاضر میں جن کی معنویت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں ہے جن کی معنویت آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ نازک اندامان کالج سے خطاب ''شریک زندگی سے خطاب'' 'ضعیفہ'' سہاگن بیوہ'' حسن اور مزدوری'' جنگل کی شہزادی'' فتنۂ خانقاہ، جیسی نظمیں آج بھی معنویت کی حامل ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جوش عورت سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود اسے شبستان طرب سے باہر نہیں دیکھنا چاہتے، ہاں انھیں باہر جب مغرب زدہ عورت نظر آتی ہے تو وہ برداشت نہیں کر پاتے۔ نظم 'پیرزن' میں مغرب زدہ عورت کے خلاف زہر اگلا گیا ہے۔ مثلاً 'اس مشن اسکول کی ڈائن سے یارو ہوشیار'

ایسا نہیں ہے کہ جوش عورت کی تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھ سکتے یا دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان کے یہاں عورت کا کردار خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اجاگر ہے۔ جوش کو اگر ایک طرف کوہستان دکن کی عورتیں، دکھائی دیتی ہیں تو دوسری طرف انھیں، جامن والیاں، نظر آتی ہیں۔ ایک طرف کسی پیکر حسن و شباب پر ان کی نظر ٹھہر ٹھہر جاتی ہے تو دوسری طرف بے سہارا اور ہڈیوں کے ڈھانچہ میں کراہتی ہوئی ایک ضعیفہ بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ آج کچھ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں بے سہارا ضعیفوں کو آسرا دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ انھیں سرکار کی طرف سے پنشن دیے جانے کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر نظم 'ضعیفہ' کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ جس میں شاعر حکومت وقت کی سرد مہری کو نشانہ بناتا ہے۔ اس مضمون میں جوش کے مجموعے، فکر و نشاط، شعلہ و شبنم میں شامل، سہاگن بیوہ، اور حسن اور مزدوری کے نسوانی کردار کی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے اور ان کے حسن استقلال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظم، سہاگن بیوہ، میں شاعر اپنی بات شروع کرنے سے پہلے خوبصورت سماں باندھتا ہے۔ اس کے لئے وہ اکثر منظر نگاری اور مشاہدے کی باریک بینی سے کام لیتا ہے۔ 'سہاگن بیوہ' حالی کی نظم 'مناجات بیوہ' کی یاد دلاتی ہے۔ حالی کی نظم میں مسلم معاشرہ کی ایک جوان بیوہ بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہے کہ وہ اس بھری دنیا میں کیسے اپنی زندگی کے دن کاٹے گی۔ جوش کی اس نظم میں ہندو پریوار کی ایک جوان بیوہ کا ذکر ہے۔ نظم بیانیہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ شام کا وقت ہے اور تلسی داس گنگا کے کنارے ہری کا نام جپتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ تیسرے شعر سے بارہ اشعار تک منظر نگاری سے

فضا بندی کا کام لیا گیا ہے منظر میں اداسی گھلی ہوئی ہے:

شام کا چہرہ غم پنہاں سے کچھ اترا سا تھا☆ پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سناٹا سا تھا

بڑھتی ہوئی شام کی تیرگی کے ساتھ تلسی داس کے دل کی گھبراہٹ بھی بڑھ رہی تھی۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ:

'سانحہ کوئی قیامت خیز پیش آنے کو ہے'

اداس شام کی منظر کشی کے بعد نظم ایک اہم موڑ لیتی ہے۔ تلسی داس کی نظر ''ایک گوشے کی طرف پہنچی''، جہاں انھیں ایک جلتی ہوئی چِتا نظر آئی۔

اس روح فرسا منظر سے 'جنگل کی سیاہی'' کانپ اٹھتی ہے'۔ ایک سہاگن جس کے ہاتھ میں مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہ ہوا، 'اپنے ارمانوں کو چِتا میں جلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ روایتی نئی نویلی دلہن کا کردار ایسے روح فرسا حادثے پر اظہار غم سے بھی شرماتا ہے۔ لیکن یہاں جو نسائی کردار ابھرتا ہے وہ روایت سے انحراف کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بیوہ شدت غم سے گھبرا کر چانک:

خاک سے اٹھتی ہے پھر کرتی ہے شعلوں کا طواف
کہتی ہے اے شرم کی دیوی ! مجھے کرنا معاف

تیرہ اشعار میں بیوہ کی زبان سے جوش نے شدت جذبات میں ڈوبے ہوئے کلمات ادا کروائے ہیں۔ ہندو مذہبی روایت رہی ہے کہ بیوائیں اپنے شوہر کے ساتھ جل کر خاک ہو جاتی تھیں کبھی اپنی مرضی سے تو کبھی سماج کے زور زبردستی سے۔ یہاں یہ بیوہ بھی اپنے پتی کے ساتھ جل جانا چاہتی ہے۔ یہاں صرف دو اشعار سے مثالیں دی جا رہی ہیں:

آپ کے سینے سے شعلے اٹھ رہے ہیں بار بار
جل رہی ہے یہ مری اجڑی جوانی کی بہار
پوچھیے اس سے کہ دنیا کیا تھی اور کیا ہوگئی
جس نے گھونگھٹ بھی نہ الٹا تھا کہ بیوہ ہوگئی

وہ جلد ہی اپنی زندگی کے بندھن سے آزاد ہو جانے کی متمنی نظر آتی ہے' زندگی سے بیزاری اس سے کہلواتی ہے:

زندگی جادور ہو دنیا ہے آنکھوں میں اجاڑ
موت جلدی کر' کہ ٹوٹا ہے رنڈاپے کا پہاڑ

نظم کا یہ حصہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہاں بیوہ موت کو رازِ کمالِ زندگی' مآلِ زندگی' سر بقا تاجِ حیات عالمِ ارواح کی شاہزادی جیسے پرشکوہ القابات سے نوازتے ہوئے چتا میں جل جانے کے لیے آگے بڑھتی ہے کہ تلسی داس سامنے آجاتے ہیں۔ اب محاکاتی فضا ابھرتی ہے۔ مثلاً:
'دیکھتے ہی آپ کو کم سن تو تھی گھبرا گئی یا 'انگلیاں اپنی مروڑیں دیر تک' دیوانہ وار' نظم کا یہ حصہ بیوہ کی دلی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہاں جذبے کی شدت نہیں بلکہ ٹھہراؤ کی کیفیت ہے۔ تنہا رہ جانے کا احساس اسے تڑپاتا ہے۔ زندگی کو پاپ سمجھ کر اس سے چھٹکارا چاہتی ہے:

چپ ہوئی تو اور دردِ ہجر دونا ہو گیا
دی صدا دل نے ترا پہلو تو سونا ہو گیا
یہ صدا سنتے ہی دم الجھا پھر یری آگئی
اک گھٹا دل سے اٹھی ارض و سما پر چھا گئی
رو کے پھر کہنے لگی بابا دو ادیجے مجھے
زندگی کے پاپ سے جلدی چھڑا دیجے مجھے

بیس اشعار میں جوش نے تلسی داس کی زبان سے نہایت بصیرت افروز باتیں کہلوائی ہیں۔ تلسی داس صوفی منش شاعر ہیں۔ زندگی اور موت کے فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہاں صوفیا کا وہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ تلسی داس کی حکمت آمیز گفتگو میں اسی نظریے کی کارفرمائی ہے:

کہتے ہیں فانی جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں
قیدِ ہستی سے کوئی ذرہ رہا ہوتا نہیں
ٹوٹ جاتا ہے قفس طائر فنا ہوتا نہیں

تلسی داس زندگی کو ایک دھندلے سے جلوے اور موت کو باریک پردے سے تعبیر کرتے

ہوئے بیوہ سے اس طرح مخاطب ہیں:

مر کے بھی دریا کے سینے سے جو جاتے نہیں
رہتے ہیں دریا میں لیکن نظر آتے نہیں
یونہی تیری شمع سوزاں بھی تری محفل میں ہے
مرنے والا آنکھ سے اوجھل ہے لیکن دل میں ہے

شاعر تلسی داس اپنی مشفقانہ باتوں سے بیوہ کے زخموں پر تسلی کا مرہم رکھتے ہیں۔ان کی ہمدردانہ گفتگو جاری رہتی ہے مثلاً:

جو چتا میں جل رہا ہے وہ ترے پہلو میں ہے
کانپتے ہونٹوں میں ہے بہتے ہوئے آنسو میں ہے

اور پھر:

دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھل گئیں

ایک دانا اور دور اندیش بزرگ شاعر کی نصیحت آمیز گفتگو بیوہ کے دل پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔زندگی کی تلخ سچائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر لیتی ہے۔اس جانکاہ صدمے کو سہنے کی طاقت اب اس کے اندر پیدا ہوگئی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ نظم یہاں ختم ہوگئی ہے۔یہ نظم اگر یہاں ختم ہو جاتی تو اس کے تاثر پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔سچ تو یہ ہے کہ نظم یہاں سے پڑھنے والے کے ذہن میں شروع ہو جاتی ہے، مگر نظم کے عنوان کی معنویت جاتی رہتی ہے۔نظم کو اختتام کی منزل تک پہنچانے کے لیے زود گو شاعر بارہ اشعار کا مزید اضافہ کرتا ہے۔یہاں صرف ایک شعر سے مثال دی جاتی ہے۔:

ہنس کے پھر کہنے لگی بابا مرا وسواس تھا
دور میں جس کو سمجھتی تھی وہ میرے پاس تھا

یہاں پھر نظم کے ختم ہونے کا گمان ہوتا ہے۔مگر رطب اللسان شاعر کو زلف کی تابندگی اور رخ کی دمک کی مزید تفصیل بھی دینی تھی۔اب اس نظم کا حزنیہ لہجہ نشاطیہ لہجے میں بدل جاتا ہے مثلاً:

صحن غم میں باغ عشرت کی ہوا آنے لگی

کان میں راحت کے نغموں کی صدا آنے لگی
زیر لب کہنے لگی عالم ہے کیا تنویر کا
دل مرا شیشہ ہے ان کی چاند سی تصویر کا

آخر یہ جوان بیوہ غم کے اتھاہ سمندر سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ نظم اختتام کو پہنچتی ہے۔

خاک تلسی کی نظر میں رشک گلشن ہو گئی
معرفت میں ڈوب کر بیوہ سہاگن ہو گئی

اس نظم میں عورت کا کردار ارتقائی مدراج طے کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جوش کی نظم سہاگن بیوہ میں ہندو سماج کی سانسیں سنائی دیتی ہیں۔ یہاں ہندوستانی عورت کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں کہیں نہ کہیں اقبال کی مشہور زمانہ نظم خضر راہ کا اثر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خضر راہ کے ابتدائی حصے میں فطرت کی عکاسی جس طرح کی گئی ہے اس کی جھلک سہاگن بیوہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال نے اپنی آواز کو موثر بنانے کے لیے تیسری آواز کا استعمال کیا ہے۔ اقبال کو اسلامی معاشرے کی عکاسی کرنی تھی لہٰذا انھوں نے خضر جیسی جہاں دیدہ اور فلک پیما ہستی کو منتخب کیا۔ جوش نے بھی یہاں تیسری آواز سے کام لیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ہندو معاشرے کی محترم شخصیت تلسی داس کا انتخاب کیا۔ جوش کی نظم سہاگن بیوہ اقبال کی خضر راہ کے درجے تک تو نہیں پہنچتی تاہم اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شعلہ و شبنم کی ایک خوبصورت نظم حسن اور مزدوری ہے۔ دھوپ میں مزدور دوشیزہ کو مزدوری کرتے ہوئے دیکھ کر شاعر کا دل بھر آتا ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا

اس نظم میں مزدور لڑکی کی بیچارگی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے:

گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں

نازکی بل کھا رہی ہے دیدہ ء غمناک میں

شاعر افلاس کے مارے ہوئے ہندوستان پر آہ بھرتا ہے جہاں:

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دست نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے

نظم کے اس حصے میں جوش کے یہاں عورت کا متحرک تصور ابھرتا ہے۔ صنف نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے انھیں برداشت نہیں ہوتا۔ دوشیزہ کی جبیں پر پسینہ اور گرد و غبار میں اٹی صورت شاعر سے دیکھی نہیں جاتی وہ ہاتھ جو مہندی رچانے کے لیے بنے ہوں وہ آنکھیں جو کاجل کا بار نہ اٹھا سکتی ہوں، ان پر راستے کا غبار دیکھتے ہیں تو انھیں رنج ہوتا ہے۔:

بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے
نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہوں کاجل کا بار
اس سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوش عورت کو بزم ناز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسے بزم عمل میں دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہے۔ مثلاً نظم کے یہ ٹکڑے:

آسماں جان طرب کو وقف رنجوری کرے،
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لیے
جس کا مکھڑا ہو شبستان طرب کے واسطے

جوش نے نظم حسن اور مزدوری میں جزیات نگاری سے کام لے کر حالات کی ماری خوبصورت دوشیزہ کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ لیکن زندگی کی تگ و دو میں جس طرح وہ اپنا کردار نبھار ہی ہے اس کے کردار کا یہ پہلو اگر چہ جوش کو بہت صاف دکھائی نہیں دیتا لیکن آج اسی پہلو کی معنویت ہے۔

نظم یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ تو تمہیدی حصہ تھا۔ دراصل نظم تو اب شروع ہوتی ہے اور پوری طرح انقلابی و سیاسی رنگ میں شرابور ہو جاتی ہے۔ شاعر مادر ہند کی بے بسی کی تصویر پر آہ بھر

تا ہے جہاں بقول اس کے نازنینوں کا یہ عالم ہے کہ انھیں محنت و مزدوری کر کے گھر کی کفالت کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس طبقے کی عورتیں یوں بھی اپنے مردوں سے زیادہ محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں۔ شاعر غلام ہندوستان کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے عورت کی اس حالت زار کا سبب پوچھتا ہے۔ شاعر اسے شب تاریک سے تعبیر کرتا ہے جو اپنی بزم اختر سے محروم ہے:

سر برہنہ کیوں ہے وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی
اے شب تاریک ! تیری بزم اختر کیا ہوئی؟
جس کے آگے تھا قمر کا رنگ پھیکا کیا ہوا
اے عروس نو ! ترے ماتھے کا ٹیکا کیا ہوا؟
اے خدا! ہندوستاں پر یہ نحوست تا کجا ؟
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا؟

آگے پھر شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ آخر یہ صورت حال کب تک رہے گی۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

سر زمین رنگ و بو پر عکس گلشن تا کجا
پاک سیتا کے لیے زندان راون تا کجا

پروفیسر گوپی چند نارنگ اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حسن اور مزدوری کا شمار بعض نرم دل حضرات جوشؔ کی بہترین نظموں میں کرتے ہیں۔ اس کے جذبۂ عوام دوستی اور وطنیت میں کلام نہیں........لیکن اس جذبہ وطنیت کی تان بالآخر اس خیال پر ٹوٹتی ہے۔"

۱۹۲۶ میں لکھی گئی یہ نظم جوشؔ کی بہترین نظموں میں نہ سہی بہتر نظموں میں ضرور شمار کی جائے گی۔ آج بھی آزادی کے بعد مزدور عورت کنکر کوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آج بھی یہ عورتیں اپنے مردوں سے زیادہ محنت کرتی ہیں وہ ان کی طرح کام چور نہیں ہوتیں۔ پہلی مذکورہ نظم کا نسائی کردار بہار اور خزاں کے موسم دیکھتا ہے۔ اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اپنے اندر زندگی کی سچائیوں سے آنکھ ملانے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔ دوسری نظم حسن اور مزدوری میں ایک غریب اور

خوبصورت لڑکی میدان عمل میں مردانہ وار کھڑی دکھائی دیتی ہے۔اس نظم کے پانچ سال بعد لکھی ہوئی نظم نازک اندامان کالج سے خطاب میں ان کے خیال کافی ترقی پسندانہ ہیں۔یہاں وقت کی نزاکت سے لاپرواہ کالج کی لڑکیوں سے مخاطب ہیں۔تلخ لہجہ میں ان کی توجہ وقت کے جلتے مسائل کی طرف مبذول کراتے ہیں۔مثلاً:

جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی،
شغل زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

غرض جوشؔ نے اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ادب میں انقلاب واحتجاج کی آواز بلند کی۔انھوں نے عورت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا۔ان کے یہاں ایسی کئی نظمیں ہیں جن کی معنویت آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔جوشؔ کی آواز اپنے عہد کی بلند آواز تھی۔یہ آواز ان کے بعد کی نسل مثلاً فیضؔ، مجازؔ اور دیگر ترقی پسند شعرا کے کانوں تک پہنچی۔عورت کے کردار کو فیضؔ، مجاز، سردار اور کیفیؔ نے جس طرح بنا سنوار کر پیش کیا اس میں جوشؔ کی آواز کو بہت دخل ہے۔ترقی پسند شعرا کے یہاں ان کی اس روایت کی توسیع نمایاں طور پر ملتی ہے۔ترقی پسند شعرا کے یہاں عورت کا صحت مند تصور ایک روایت بن گیا۔کوئی بھی صحت مند روایت ایک دن میں نہیں بنتی۔جوشؔ کی وسعت نظر نے عورت کے کردار کو خود اعتمادی بخشی۔یہی خود اعتمادی نسائی ادب کی تخلیق کو بنیاد فراہم کرتی ہے آج نسائی فکر اور نسائی ادب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔خواتین کے ادب پر سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں، معتبر ادبی رسائل خواتین نمبر نکالتے ہیں یا کوئی گوشہ ان کے لیے مختص کر دیتے ہیں۔ان تمام سرگرمیوں کے پس منظر میں جوشؔ کی وسعت نظر کا اہم رول ہے۔بلاشبہ جوشؔ ترقی پسند تحریک کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ترقی پسند تحریک نے اقبالؔ اور جوشؔ کا اثر قبول کیا لیکن عورت سے متعلق ترقی پسند شعرا کے یہاں جوشؔ اور اقبالؔ کی بعض روایت سے انحراف بھی ملتا ہے۔ترقی پسندوں کے یہاں عورت کارزار حیات میں ان کی رفیق کار اور مونس و ہمدم کی شکل میں ہرگز سامنے نہ آتی اگر جوشؔ ذہنی طور پر انھیں آمادہ نہ کرتے۔

بہر کیف جوشؔ کی ان دونوں نظموں سہاگن بیوہ، اور حسن اور مزدوری میں عورت کے

ساتھ ہمدردی اور اپنائیت کا شدید جذبہ ابھرتا ہے۔ خالص بیانیہ اسلوب میں کہیں پھیکے پن کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ خوبصورت تشبیہات اور استعارات کے ہلکے اور گہرے رنگ اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان دونوں نظموں میں عورت کا فعال کردار ابھرتا ہے۔ یہی فعال کردار ترقی پسند تحریک کا پسندیدہ موضوع بنا۔ آج بھی عورت کے اسی فعال کردار کی ضرورت ہے تا کہ زندگی کی تگ و دو میں وہ اپنا کردار بخوبی نبھا سکے۔ جوش کی شاعری کو بے وقت کی راگنی کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ماس کی معنویت آج بھی ہے۔ آج بھی ایماں شکن واقعات رونما ہوتے ہیں آج بھی فتنہء خانقاہ کی عورت دکھائی دیتی ہے، آج بھی سڑک پر بے سہارا ضعیفہ نظر آتی ہے۔ آج بھی بعض بدقسمت سہاگنیں بیوگی کے عذاب سے گزرتی ہیں۔ آج بھی دوشیزائیں پتھر توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ غرض جوش کی بعض دوسری نظموں کی طرح یہ دونوں نظمیں بھی اہمیت کی حامل ہیں اور عصر حاضر میں جوش کی معنویت کا احساس دلاتی ہیں۔

☆☆☆

ا؎ کلیم الدین احمد

۲؎ نیاز فتح پوری

۳؎ گوپی چند نارنگ۔ آجکل جوش نمبر، اپریل ۱۹۹۵ء

جوشؔ بحیثیت اشتراکی وانقلابی شاعر

ڈاکٹر عزیزہ بانو

حالیؔ، اکبر، چکبستؔ، اقبالؔ وغیرہ نے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک اردو شاعری میں اشتراکی انقلابیت اور سماجی بیداری کی جو روح پھونکی۔ ممکن ہی نہ تھا کہ بعد کے شعراء ان اثرات سے اپنے کو بچا پاتے۔ دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی حالات بھی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرر ہے تھے۔ ان شاعروں کے کارناموں سے پوری اردو شاعری میں انقلاب واشتراک کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ سبھی شعراء اپنی اپنی بساط کے مطابق شاعری کرتے رہے۔ جوشؔ ان شعراء کے بعد ایک نمایاں و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

''کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوشؔ فطری طور پر باغی تھے۔ وہ کسی بھی سرمایہ دارانہ نظام سے مطمئن نہ رہ سکے۔ انگریزی حکومت کے خلاف نظمیں کہیں۔ وہ ہمیشہ آزادی کے خواب دیکھتے رہے لیکن ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ''ماتم آزادی'' کے عنوان سے ایک نہایت سخت نظم لکھی۔ اس نظم کا لب ولباب یہ تھا کہ جس حسین اور خوبصورت آزادی کا خواب دیکھا تھا افسوس کہ اس کی تعبیر بہت خراب نکلی چنانچہ افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے

اترا جو بار اور گراں بار ہو گئے
آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہو گئے
پگھلا جو آسماں تو زمیں تنگ ہوگئی
''یوں پوپھٹی کہ صبح چمن دنگ ہو گئی''

برطانوی سامراج، پیمان محکم، غلاموں سے خطاب، حسن اور مزدوری آثار انقلاب، زوال جہابنانی، بغاوت شکست زنداں کا خواب اور وطن جیسی معرکہ آرا انقلابی نظمیں لکھیں۔

جوشؔ کی وہ نظمیں جو وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ان نظموں میں حکومت کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔ جوشؔ نے براہ راست انگریزی حکومت اور برطانوی استبداد پر حملہ کیا ہے۔ جوشؔ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے عوامی پہلوؤں پر اپنی مشہور نظم شکست زنداں کا خواب میں روشنی ڈالی ہے۔اس نظم میں انہوں نے انگریزی حکومت کے جبر سے پیدا ہوائے ہیجان اور انتشار کو پیش کیا ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکے یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم کی بجلی، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

نظم وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستاں کے نام بھی جوشؔ کے بڑھتے ہوئے جذبۂ انتقام اور نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت ہندوستان کے تقریباً ہر باشندے کے دل میں موجود تھی۔اس نظم میں نہ صرف حکومت برطانیہ پر طنز ہے بلکہ برطانوی استبداد کے خلاف شدید نفرت کا احساس بھی موجود ہے۔شاعر نے تخیل میں ایسے باوفا غلاموں کی تخلیق کی ہے جو بغاوت پر آمادہ ہیں اور حکومت وقت کا تختہ الٹ دینا چاہتے ہیں۔اس نظم میں شاعر محکوموں کی زبانی شہنشاہ ہندوستان کو باخبر کرتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب بادشاہی کا چراغ گل ہوتا ہوا نظر آئے

گا۔ کیونکہ وہ غلام اور مزدور جن کو تم نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اب ان کے اندر بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے اور ان لوگوں کے ارادے خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں ان کا ارادہ مانند سیلاب کے ہے جواب روکنے سے نہیں رکے گا۔

ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نو جواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثار حرب وجنگ ہیں
کشور ہندوستاں میں رات کو ہنگام خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
ہم وفا داران پیشیں، ہم غلامان کہن
قبر جن کی کھد چکی، تیار ہے جن کا کفن
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
چونکئے جلدی ہوائے تندو گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے جس وقت شاعری شروع کی وہ ۱۹۱۹ء کے آگے کا زمانہ ہے جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جنگ کے جو نتائج ملک اور عوام کو بھگتنے پڑتے ہیں اسی کیفیت سے ہندوستان بھی دو چار تھا۔ پورے ہندوستان میں افراتفری کا عالم تھا۔ جوشؔ بھی اپنے اردگرد کے ماحول کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نتیجہ ان کی شاعری بھی اپنے گردو پیش کے سیاسی وقومی ماحول سے متاثر ہوئی۔ ملک کی ابتر حالت، عوام کی زندگی ،ادنیٰ اور گرے ہوئے طبقے کی بدتر حالت ان کے اندر جذبات کا ایک طوفان برپا کر رہی تھی۔ اس

لئے انہوں نے اپنے امنڈتے ہوئے جذبات واحساسات کی ترجمانی مختلف انداز میں کی اور اس میں بغاوت کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔

اقبالؔ اور چکبستؔ کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاست اتنی پرزور اور بے باک نہیں تھی جتنی جوش کی شاعری کے عروج کے زمانہ میں ہوگئی تھی۔ جوشؔ کے وقت میں عوام میں جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔لوگ جذبات کو کام میں لاکر تیزی سے آزادی کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے۔ جوشؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جس کی اس وقت لوگوں کو سخت ضرورت تھی۔ایسے میں جوشؔ کی آواز جنگی نقارے کی صدا ثابت ہوئی۔

جوش اپنی شاعری کے لئے موضوعات کا انتخاب زندگی کی متحرک چیزوں سے کرتے ہیں۔ جوش کی شاعری میں جوش وخروش اور ایک غیر معمولی ہمت اور مردانگی ہے۔اور اسی سے ان کی شاعری بھی جاندار ہے۔ ''بغاوت، سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
الاماں و الحذر میری کڑک میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

شکست زنداں کا خواب سے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
سنبھلو کی وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

جوشؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور اہل وطن کو ثابت قدم رہنے پر آمادہ کیا۔کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی

آزادی کے خواہشمند ہیں بلکہ ان کے ذہن میں جدید نظام کا ایک تصور بھی ہے۔

کھیل ہاں اے نوعِ انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولا ہے تو کیا
چل چکی ہے پیشوائی کو نسیم باغ صبح
آج یوسف مبتلائے چاہ کنعاں ہے تو کیا

جوشؔ کی نگاہیں ان بے راہ رویوں اور بدعنوانیوں کو دیکھ لیتی ہیں جس سے ملک وقوم کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے وہ چیخ اٹھتے ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور۔

''وہ سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں، کسانوں کی زبوں حالی، غداروں کی سیاست، نازک اندامان کالج کی نسائیت، نصرانیت کی طرف اقدام مولویوں کی ریاکاری، معاشرت میں روپئے کی کارفرمائی برداشت نہ کرسکے اور چیخ اٹھے۔ شدت جذبات کی وجہ سے ان کی آواز میں کرختگی آگئی۔ غم وغصہ نے الفاظ کو آتشیں لاوا بنا دیا۔[1]

[1] نئے اور پرانے چراغ پروفیسر آل احمد سرور ص ۳۲

جوشؔ نے مزدوروں کے گیت بھی گائے ہیں اور ایک نئی دنیا بسانے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ مزدوروں محنت کشوں، کسان اور غلام ہندوستان میں بسنے والے سبھی لوگوں کی غیرت اور جرائت کو للکارا ہے۔ سماجی پستی جوروستم، ظلم اور جبر وتشدد کے خلاف اظہار وہ اس بے باکی سے کرتے ہیں کہ ان کے سامنے قصر شاہی اور جلال شاہی کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں۔ جبر واستبداد کی گردن پر ان کا قلم مانند شمشیر کے چلتا ہے۔ وہ کاشتکاروں کو صحیح معنوں میں ارتقاء کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار مانتے ہیں۔ کیونکہ کاشتکاروں کے بل پر ہی تہذیب وتمدن کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک نظم کسان ہے جو حقیقت میں کسان کا قصیدہ ہے۔

ناظر گل پاسبان رنگ وبو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
سرنگوں رہتی ہیں جن سے قوتیں تخریب کی

جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن انسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہر یار

نظم کسان کے آخری حصہ میں انھوں نے سرمایہ داری پر کاری ضرب لگائی ہے اور کاشتکاروں کی غربت و افلاس کا واحد ذمہ دار سرمایہ داروں کو ٹھہرایا ہے کیونکہ انہیں چند بڑے لوگوں نے نظام کو درہم برہم اور معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ وہ سرمایہ داروں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب میں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

خواب غفلت سے لوگوں کو بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آیا وہ انقلاب آیا جاگو
فرمان شکست خواب آیا جاگو
اے ہند کے بد نصیب سونے والو
سر پر وہ آفتاب آیا جاگو

انقلابی شاعر کا دوسرا نظریہ اشتراکی حقیقت نگاری ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں ہمیں سوشلسٹ رجحان بھی مل جاتے ہیں۔ اشتراکیت کی جھلک کلام سے ملاحظہ ہو

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ وخشت سے چنگ و رباب پیدا کر
جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے

تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

سوشلزم کی جھلک جوش کی اس رباعی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے

''زردار کا خنّاس نہیں جاتا
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا
ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی
تا عمر وہ افلاس نہیں جاتا''

جوش نے اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔قوم اور ملک کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تلقین کی ہے۔شاعری سے ملک میں انقلاب لانے کا کام لیا ہے۔جوش کی شاعری تمام عصری مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔سرمایہ داروں اور ظالموں کو للکارتی ہے اور عوام کو ان سے بدلہ لینے کا سبق دیتی ہے۔اردو شعر و ادب کو ایسے شاعر پر ناز ہے جس نے اقبال و چکبست کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے ایک مستحکم روعطا کی اور اسے زندہء جاوید بنا دیا۔

بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین

''وہ اپنے کلام سے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی طرح حسن عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔مگر بعض اوقات لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی شیریں کلامی تلخ نوائی میں بدل جاتی ہے، خواہ اسے ان کے شدید احساسات پر محمول کیجیے یا خواب گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھئے۔''[1]

[1] تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص ۱۸۵

☆☆☆

جوش کی شاعری کی مختلف جہات

نعیم السحر صدیقی

یہ حقیقت ہے کہ جوشؔ کو اس وسیع تناظر میں نہیں سمجھا جاسکا جس کے وہ حقدار تھے۔ الفاظ پر زیادہ اور خیالات پر کم توجہ دی گئی۔ مطالعہء جوشؔ کے وقت ناقدین اکثر کسی نہ کسی نظریاتی مسئلے کا شکار ہو گئے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے ترقی پسندوں نے بھی انہیں پنایا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوشؔ پوری طرح ترقی پسند بھی نہ تھے۔ کیونکہ جب وہ اپنی ذات اور خمریات کا ذکر کرنے لگتے تھے تو عوام کا دور دور تک پتہ نشاں نہ ہوتا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا اور جب وہ انسان کا درد اور بے کسی دیکھتے تھے تو شبابیات اور خمریات کی شاعری کو فراموش کردیتے تھے۔ اور بڑی آب وتاب سے انسانیت کے ترانے تخلیق کرتے تھے۔ نظم ''اکتارہ'' میں جوسوز، حساسیت اور انسان دوستی ہے اس میں ایک قلندرانہ شان نظر آتی ہے۔

ملاّ پانڈے، پیر، ابھمانی
لٹھم، لٹھا، کھینچا، تانی
من ہیں اندھے بدھی کانی
پہنے ہیں یہ سب اگیانی
میرے گیانی من کی اترن
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن
سب کی جھولی، میری جھولی

سب کی ٹولی، میری ٹولی
سب کی ہولی، میری ہولی
سب کی بولی، میری بولی
سب کا جیون ،میرا جیون
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن

پتّا پتّا، ماہ کنعاں
بوٹا بوٹا، جیتا انساں
مکھڑا مکھڑا گیتا قرآں
کیسا کفر اورکیسا ایماں
وہ بھی پھسلن یہ بھی پھسلن
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن

سب کے کاجل، میرے پارے
سب کی آنکھیں ، میرے تارے
سب کی سانسیں میرے دھارے
سارے انساں، میرے پیارے
ساری دھرتی میرا آنگن
بول اکتارے جھن جھن جھن جھن

ایسا لگتا ہے کہ جوشؔ کسی ایک نقطہء نظر کے پابند نہیں رہنا چاہتے تھے لیکن وہیں انسان دوستی کے تحت ان کا یہ اعتراف بھی تھا۔

فکر اصلاح معیشت ہے اگر بچوں کا کھیل
تو بہ ایں پیرانہ سالی آج تک بچہ ہوں میں
اشتراکیت اگر ہے خدمت دل خستگاں
تو یقیناً اشتراکی قوم کا مولا ہوں میں

''برپاپوش قلندر ۱۹۴۹ء
(سرود وخروش)

یعنی سب کچھ انسان ہی ہے اور اِلّا انسان کچھ بھی نہیں۔ جوش کے لئے زندگی بہت اہم تھی اور جب وہ اس زندگی میں ابتری اور ناہمواری، ظلم اور جبر دیکھتے تو خدا پر بھی طنز کرتے تھے۔۔۔۔۔

[''ہوں'' ۱۹۴۶ء سرود وخروش]

جب کہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش
باپ کی صرف ایک ''ہوں'' نے کر دیا سب کو خموش
''ہوں'' بزرگ خانداں کی آہنی دیوار ہے
ہر فساد وغلغلے کو ایک ''ہوں'' درکار ہے
سنتے ہیں انسان کا ہے باپ ربِّ کائنات
اس لئے اے دوست تجھ سے پوچھتا ہوں ایک بات
جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندّیاں
کوئی ہوں اس وقت کیا گونجی تھی زیرِ آسماں؟
تحفتاً آئے تھے جب مقتول انسانوں کے سر
پھٹ پڑی تھی کیا کوئی ''ہوں'' خیمہء چنگیز پر
شعلہ ہائے حکم نیرو جب کہ تھے بھڑکے ہوئے؟
ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی بام عرش سے؟
جب بہا تھا کربلا کی خاک پر دریائے خوں
دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک'' ہوں''؟
آئی ٹم نے رکھ دیا تھا بھون کر جب ایک شہر
قلزم تنبیہ میں آئی تھی کیا اس وقت لہر
بستیاں غلطیدہ تھیں جب خون کے گرداب میں
کوئی'' ہوں'' گرجی تھی کیا ''بنگالہء وپنجاب'' میں؟

اتنی چپ سادھے ہوئے ہے کس لئے عرش بریں
کیوں ہمارا آسمانی باپ ''ہوں'' کرتا نہیں؟

نظم میں عیسائی مذہب اور تصورات پر طنز ہے اور یہ طنز اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ جب خدا انگریزوں کا باپ ہے تو وہ کیوں انگریزوں کے ذریعے پھیلائی جا رہی تباہی اور بربادی پر تنبیہ نہیں کرتا۔

طنز کا نشتر جوش کے یہاں بہت تیز ہوتا ہے۔ مثلاً خانقاہوں پر طنز کرتے ہیں۔ ؎

یاں بہت سے کمال آتے ہیں
ہاتھ چلتے ہیں، حال آتے ہیں
یاں زرومال دینے آتے ہیں
لوگ اولاد لینے آتے ہیں
ہر حکایت ہے یاں زر و گوہر
خلد ملتی ہے یاں کرائے پر
یاں دعاؤں کی فیس ملتی ہے
زر ملے تو زبان ہلتی ہے
یاں کے ذرے نہیں نگینے
یاں مقابر نہیں، دفینے ہیں
صورتیں غرق خود نمائی ہیں
داڑھیاں کاسۂ گدائی ہیں
کون بہتر ہے ایزدباری
ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

''خانقاہ'' ۱۹۲۷ء

''پندارعبادت'' میں لکھتے ہیں۔ ؎

کیا عبادت کا ہے یہی مقصود
رحم کی راہ، دل پہ ہو مسدود؟

کیا یہی رسم ہے کہ بعد وضو!
برف ہو جائے عابدوں کا لہو؟
لب پہ ہو ذکر دین و ایماں کا
دل ہو مہرہ بساط شیطاں کا
کیا نبات بہشت کی تخئیل
دل کو کرتی ہے سنگ میں تبدیل
کیا اثر ہے یہ پار سائی کا
خاک دعویٰ کرے خدائی کا؟
موسم گل خزاں کی رت بن جائے
بت شکن خود ہی ایک بت بن جائے
ذوق تقویٰ میں دل کا نام نہ آئے
آدمی، آدمی کے کام نہ آئے
یا پھر یہ کہ ''تو دل کی زندگی کو مردوں سے مانگتا ہے''
نظم ''بادشاہ کی سواری'' میں لکھتے ہیں
چلے تو کیسے چلے نبض کو چہء و بازار
ابل رہا ہے تحکم، برس رہا ہے وقار
''ارے یہ موڑ پہ تیور اکے کون شخص گرا؟
''حضور ! ساٹھ برس کی مریض اک بڑھیا''
اسے ہٹاؤ کہ اس کا اثر برا ہوگا
جبین شاہ پہ بل پڑ گئے تو کیا ہوگا
جہاں پناہ غضب ناک ہو نہ جائیں کہیں
نگاہیں شاہ کی نا پاک ہو نہ جائیں کہیں
خدا کا شکر کہ پھر ''بادمشکبار'' آئی

''ادب کے ساتھ'' کی آواز بار بار آئی
فلک نے جان لیا اور زمین مان گئی
کسی کی آئی سواری، کسی کی جان گئی

انگریزی تقلید پر بھی طنز ہے ۔

پوششیں مغربی اماموں کی
صورتیں مشرقی غلاموں کی
جسم ہندی میں جان انگریزی
منھ کے اندر زبان انگریزی
اپنے لہجوں سے ہاتا پائی تھی
حلق کی ساخت سے لڑائی تھی
چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے
لہجہ ''صاحب'' سے اپنا مل جائے
جوش پنجاہ سالہ جوبلی کا
آپ سمجھے کہ مدعا کیا تھا؟
یہ جتاتا تھا دیکھو بڑھ گئے ہم
سوئے نصرانیت پچاس قدم!
آنچ گم، ہر طرف دھواں ہی دھواں
وائے بر سعیٔ سید احمد خاں

[علی گڑھ کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی]

اس طرح کے بے شمار طنز جوش کی شاعری میں ہیں۔ لہٰذا جوش ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں مختلف جہتوں سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے مثلاً قومیت، جذباتیت، آزادیٔ خیال، بے باکی، انسان دوستی، مساوات، طنز اور توانائی۔ جوش کے یہاں انسان دوستی کو سیکولرزم کے تحت ہی سمجھا جانا چاہیے۔ اور اسی جذبے کے تحت وہ انگریزی قوم سے نہیں بلکہ اس مخصوص طبقے سے نفرت کرتے تھے جو انسانوں کو

محکوم بنانے اور سامراجیت کی توسیع کرنے میں سرگرم تھا۔ ''یادوں کی برات'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

''انگریز محبان وطن کی دل ہی دل میں قدر کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بہ حکم سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑتی تھی۔ حکمران کی حیثیت سے انگریز کمینہ لیکن من حیث القوم شریف تھا۔ اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہو جاتا تھا۔ لیکن میری قوم چونکہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے یہ اپنے خلاف آواز سن کر ٹاپیں مارنے لگتی اور کف در دہان ہو جاتی ہے۔''

''یادوں کی برات'' از ''جوش ملیح آبادی'' ۲۵۹

انگریزی حکومت کے ساتھ ہی جوشؔ اپنی قوم کو بھی لعن طعن کرتے ہیں کہ مردہ اور بے عمل قوم کسی کے بھی ہاتھوں غلام بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جوشؔ ہندوستان کی اندرونی خرابیوں پر بھی نظر رکھتے تھے جو اوہام، رسم پرستی اور اندھی عقیدت میں ملوث ہے اسی لئے جوشؔ کے یہاں امن اور اتحاد کا کوئی بھی تصور مذہب کی راہ سے نہیں آتا۔ مذہبی پیشواؤں کا انہوں نے جہاں ذکر کیا ہے وہاں ان کا مقصد غلامی سے نجات، آزادی کی جدو جہد اور اصلاحی و اخلاقی پہلوؤں کی وضاحت کے لئے آئیڈیل پیش کرنا ہے۔ یہ بات صاف ہے کہ جوشؔ نے سماج میں جن تبدیلیوں کا خواب دیکھا وہ کبھی پورا نہ ہو سکا اور غالباً یہی انکی جذباتیت کی وجہ تھی۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ سماج کے بناوٹی ڈھانچے کو مٹا دو۔ ''اشارات'' کا درج ذیل اقتباس دیکھئے۔

''یہ ایک بڑی دردناک صورت حال ہے کہ اس اندھے ہندوستان میں ہر سال بے گنتی قومیں، بے شمار جسم اور لاتعداد جانیں اغیار کی رفتہ پروری، روایات کی بازیگری اور منافرت و اوہام کی قاتلانہ مسخرگی پر بے دریغ بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ بعض بدنام تالابوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر بارش میں ایک بھینٹ لیا کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان کا ''مذہب'' وہ تالاب ہے جو آئے دن ایک نہیں ہزاروں بھینٹیں لیا کرتا ہے، اور لوگ ہیں کہ اس پر غسل

کرنے کو ذریعہ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔اور اگر یہ ''اوہام ورسوم'' جن میں ہندوستان گرفتار ہے صحیح مذہب سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے تو آیئے آج ہم آپ سب مل کر اپنی کامل بے دینی کا اعلان کردیں۔اور میناروں پر چڑھ کر پکاریں کہ دنیا والوں ہم نے مذہب کے مقدس ادارے سے رہائی حاصل کرلی ہے۔آج کی تاریخ سے ''ہندوستان'' کے علاوہ ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے۔''

''چاریار'' اشارات از ''جوش ملیح آبادی'' ۱۲۳

نظم ''ماتم آزادی'' میں وہ بڑے تیکھے انداز میں ملک کے غداروں اور موقع پرستوں پر طنز کرتے ہیں۔اور یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ملک کے حقیقی وطن پرستوں اور حاجت مندوں کو ان کا صحیح مقام نہیں ملا۔یا یوں کہیں کہ ملک کو ذہنی غلامی سے نجات نہ مل سکی۔اس لئے اگر دیکھیں تو جوش ایک ساتھ دو محاذ پر سرگرداں نظر آتے ہیں۔ان کی قومیت اس قدر جذباتی نہیں تھی کہ اپنے ہم وطنوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کردیتی۔لہٰذا اکثر مقامات پر وہ اپنا رنگ اور لہجہ تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کی ایک مثال ''نازک اندامانِ کالج سے خطاب۔'' ''مقتل کانپور'' جیسی نظموں کے ساتھ نظم'' ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' اور ''شکستِ زنداں کا خواب'' کا مقابلہ کر کے دیکھی جاسکتی ہے۔بیسویں صدی کی محکومی کے دور میں چونکہ گذشتہ ادب سماج پر صحت منداثرات قائم نہیں کرر ہا تھا اس لئے جوش ادب میں انقلاب پیدا کرنے کے خواہشمند ہوئے۔ان کی خواہش تھی کہ ادب انقلاب کا معاون ہو اور انقلاب کی راہیں ادب کے ذریعے ہموار ہوں۔''اشارات'' کے ایک فکر انگیز اقتباس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے:۔

''میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر، انتہا درجے کے حساس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں۔اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں ادیبوں کے سامنے دوزانو ہو کر گڑ گڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خوں آشام دانتوں سے چھڑا لیجئے۔اور شباب و

محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑایئے اور وطن
عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا
باب الہند تیار کیجئے۔ یاد رکھئے ایک صحیح جنبش قلم، ستر ہزار برہنہ تلواروں کے
مقابلہ میں زیادہ کارآمد آلہ ء جنگ ہے۔"

"اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" از جوش ملیح آبادی ۵۹ "اشارات"

اردو ادب کے محض ایک روش پر چلتے رہنے اور دیگر موضوعات کے فقدان کی جو شکایت جوش کو تھی اس کا اظہار "اشارات" میں ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"قطب شاہوں کے دور سے لے کر اس عہد تک شعراء کا کلام پڑھئے کیا وہی
ایک حسن و عشق کا موضوع ہر جگہ نہیں پایا جاتا؟ یہ سچ ہے کہ شاعری میں سب
سے زیادہ دلکش موضوع حسن و عشق ہی ہے لیکن شاعر کے لئے کیا یہ ممکن ہے
کہ زندگی بھر ایک ہی موضوع سے وابستہ رہے اسے اس پورے کرّہ ء ارض
کی کوئی دوسری شئے تمام عمر متاثر ہی نہ کر سکے۔ کیا ہمارے شعرائے کرام کی
زندگیوں میں کبھی مست گھٹائیں جھوم کر نہ آئی تھیں۔ کبھی پپیہا نہیں کوکتا تھا
کبھی چاندنی کھیت نہیں کرتی تھی۔ کبھی برستی اور جھومتی ہوئی راتیں بال نہیں
بکھراتی تھیں۔ کبھی پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا ان کے سامنے نہیں لہراتے
تھے اور کبھی افق کا دریچہ کھول کر دوشیزہ ء سحر ان کے روبرو نہیں مسکراتی تھی۔
اس کے علاوہ کیا ان کی معاشرت اور سیاست میں کبھی کوئی قابل ذکر انقلاب
نہیں ہوا تھا۔ کبھی ان کی قوم پر کوئی دل دہلانے والی مصیبت نہیں آئی تھی۔
کبھی ان کا کوئی دوست نہیں بچھڑ گیا تھا۔ کبھی کسی نے ان پر کوئی احسان نہیں
کیا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی یتیم کا اترا ہوا منہ اور کسی نوجوان بیوہ کی الجھی
ہوئی کاکلیں نہیں دیکھی تھیں؟ اور کیا کبھی انھوں نے کسی ظالم و غاصب کو خدا
کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا تھا؟۔

''غزل گوئی'' از جوش ملیح آبادی ۷۶ ''اشارات''
بیان کی گئی باتوں میں سے بیشتر جعفر زٹلی میر اور غالب کی شاعری میں ملتی ہیں لیکن تمام شعراء کے کلام میں نہیں خاص کر لکھنوی شعراء کے کلام میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ جوش لکھنوء کی ادبی روایت کے ایک طرح سے باغی شاعر تھے۔ اور اپنے ادب اور معاشرے کی مردہ دلی سے افسردہ خاطر تھے۔ بعض اسباب کے فقدان نے ان کے ذہن میں بہت سارے سوالات پیدا کئے اور وہ بت شکنی کی جانب مائل ہوگئے۔ دراصل کیا؟ اور کیوں؟ قسم کے سوالات نے انھیں سوچنے، غور کرنے، اپنی واقفیت کا جائزہ لینے، اپنی روح میں جھانکنے اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے پر مجبور کیا۔ اسی قسم کی غور فکر کو جب انسان اپنی تحقیقات وتخلیقات کا سرچشمہ بنانے کی سعیء کرتا ہے تو یہ کوشش اور سرگرمی فکر کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ جوش بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور شاعر جذبات اور تخیل سے یکسر عاری نہیں ہوسکتا ہاں اس کے سوالات اور فکر کا انداز اسے فکر اور فلسفے سے قریب کردیتا ہے۔

جوش کی شخصیت اور شاعری میں فکر وفلسفے کی آمیزش پر غور کرتے وقت فلسفۂ اسلام کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ہندوستانی اور مغربی فلسفے کو بھی مدّ نظر رکھنا ہوگا کہ جوش ان تینوں ہی فلسفوں سے متاثر تھے۔ جوش کے متعلق پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

> مذہب، خدا، حیات بعد موت، جبر و اختیار، مقصد حیات، علم انسانی عقل وعشق کے مقامات ان تمام مسائل پر انہوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے بعض مقامات کو پیش بھی کیا ہے۔ لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں۔ اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا بننے اور کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہورہی ہیں۔ جوش میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روحیں مل گئی ہیں۔''

''جوش ایک تعارفی مطالعہ''از''پروفیسر احتشام حسین' ۱۶۱ ''افکار، جوش نمبر''

درج بالا اقتباس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جوش نے فلسفیانہ تصورات پر غور کیا تھا۔ لیکن کسی بات پر مطمئن نہ ہو سکے۔ غالباً اس کی وجہ ان کا متشکک ذہن ہے جو کسی ایک منزل پر قناعت کرنے کو تیار نہ تھا اور جس کے لئے قرار اور سکون موت کے مانند تھے۔ جہاں تک سوال جذبات کے وفور کا ہے تو اول یہ کہ جوش شاعری کر رہے تھے نثر نگاری نہیں۔ دوسرے کسی شاعر سے خالص فلسفے کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ زندگی میں نئے نئے تجربات سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور ان سے جذباتی طور سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی کا تقاضہ ہے کہ شاعر اپنے افکار میں جذبات سے رنگارنگی اور توانائی پیدا کرے۔''اشارات''میں جوش ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظریں اپنی شاعری کے ان اثر آفریں اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو غالباً ایک شاعر کی زبان سے یہ سن کر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سر دست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ''دل''دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔''

''اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت''از''جوش ملیح آبادی''۵۸ ''اشارات''

لہٰذا فکر میں جذبات کی آمیزش اسی وجہ سے ہوسکتی ہے کہ اشعار موثر ہو جائیں۔ اور یہ رجحان محسوسات میں شدت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ جوش پست خیالات اور مبتذل اخلاق و احساسات پر بھی طنز کرتے ہیں۔ اور مصنوعی قید و بند کو توڑ دینے کی درخواست کرتے ہیں جسے انسان بے دلی اور جبر کے ساتھ اپنے مزاج پر طاری کر لیتا ہے۔ ان حالات میں حصول نشاط اور لذتیت کے جو عناصر جوش کے یہاں ملتے ہے۔ اسے''عبادت بریلوی''کا درج ذیل اقتباس سہارا دیتا ہے:۔

> ''شاعری کا مقصد حالی نے جذبات کو برانگیختہ کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ جذبات کے برانگیختہ کرنے سے ان کا مقصد بنی نوح انسان کے دل میں ایک قسم کی جولانی اور امنگ پیدا کرنا ہے تاکہ ان پر چھائے ہوئے اداسیوں کے بادل چھٹ سکیں اور ان میں عمل کی صلاحیت بیدار ہو۔ حالی کا یہ نظریہ

اپنے وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔ جس زمانے میں حالی نے اس کو پیش کیا ہے، اس وقت ہماری ساری زندگی پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔"

حالی بحیثیت ناقد۔ مقدمہ شعروشاعری کے آیئنے میں" از "ڈاکٹر عبادت بریلوی"

جوش کے فلسفیانہ تصورات کو جو مخصوص نام دیا جا سکتا ہے وہ "رومانی فلسفیت" ہے۔ جو ان کی شاعری کی رگوں میں تقریباً ہر جگہ رواں دواں ہے۔ کہیں کہیں اس میں "اپی کیورین" فلسفے کی بھی صورت پیدا ہوگئی ہے جہاں وہ اصول پرستی اور ضابطے کے بجائے رندی، آزاد خیال اور خلوص باطنی پر زور دیتے ہیں۔ اپی کیورین فلسفے کے متعلق "ڈاکٹر محمد حسن" لکھتے ہیں:۔

"رودکی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فارسی میں پہلی بار "اپی کیورس" کے اس فلسفے کو متعارف کرایا جسے بعد کو عمر خیام نے ایک مستقل نظریے کی شکل میں اپنا لیا۔ اور فارسی شاعری اور اس کے زیر اثر اردو شاعری میں اس فلسفے نے اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور تدبیر و عمل کی کم وقعتی اور علم وادراک کی نارسائی کا احساس موجود تھا۔ ظاہری عبادات، اصول پرستی اور ضابطہ کے بجائے رندی، آزاد خیالی اور خلوص باطنی پر زور تھا۔ عقل سے زیادہ جذبات کی پرستش تھی اور دنیا کی بے ثباتی سے کیف و سرمستی کا جواز اور عیش و نشاط کا استدلال پیدا کیا گیا تھا۔"

"دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر" از "ڈاکٹر محمد حسن" ۵۷ء-۷۶ء

اس کی تائید میں جوش کے اس شعر سے کرنا چاہوں گی جس میں جوش ظاہری عبادت سے اپنی رندی کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ استفسار بھی۔

کون بہتر ہے ایزد باری
ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

درج ذیل شعر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جوش عمر خیام کو اپنے عہد کا عظیم شاعر مانتے تھے لہٰذا خود کی حیثیت تسلیم کرانے کے لئے وہ عمر خیام کا حوالہ دیتے ہیں۔

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں

کہ یہ اپنی صدی کا حافظؔ و خیام ہے ساقی

جوشؔ کی نظم ''فریب ہستی'' جو ایک مختصر، جامع اور تفکرانہ نظم ہے۔ اس کے آخر میں جوشؔ اپنی بات ''حافظؔ'' کے اس شعر سے مکمل کرتے ہیں۔

بیا کہ قصر امل سخت ست نبیاداست
بیار بادہ، کہ بنیاد عمر برباد است

''فکرونشاط''

☆☆☆

نوٹ:۔ پیش کردہ مضمون میں مثالوں کی کثرت محض اس لئے کی گئی ہے کہ قارئین براہ راست بھی جوشؔ کے اشعار اور افکار سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ میرا یہ ناقص خیال ہے کہ کبھی کبھی ناقدین کی رائے قارئین کو حقیقت سے دو قدم دور کر دیتی ہے۔

☆☆☆

جوش ملیح آبادی سے متعلق چند نئی کتابیں

۱۔ جوش ملیح آبادی-ایک مطالعہ	محمد علی صدیقی
۲۔ جوش ملیح آبادی- خصوصی مطالعہ	قمر رئیس
۳۔ جوش- شخص وشاعر	اکرام بریلوی
۴۔ ہمارے جوش صاحب	خورشید علی خاں
۵۔ عرفانیات جوش	ہلال نقوی
۶۔ جوش- نئے تناظر میں	علی احمد فاطمی
۷۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی	عالیہ امام
۸۔ جوش کی پیکر تراشی	نسرین رئیس خاں

جوشؔ ۔ فیضؔ کی نظر میں

شاداب قدیر

اس حقیقت سے چشم پوشی ناممکن ہے کہ جوشؔ اقبالؔ کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت بھی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ جوشؔ کے بارے میں یہ بات اکثر دہرائی جاتی رہی ہے کہ وہ تضادات کے شاعر ہیں۔ جوشؔ کے تضادات کا مسئلہ ہی ان کے تعین قدر میں ایک رکاوٹ بنتا ہے اور یہ ایسا دشوار مسئلہ ہے۔ جسے ناقدین ابھی تک حل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جوشؔ کی افہام وتفہیم میں بھی دو متضاد نقطۂ نظر دکھائی دیتے ہیں، ایک کی نگاہ میں جوشؔ، لفظوں کا ساحر، الفاظ کا مطلق العنان بادشاہ اور زبان شناس ہیں اور دوسرے کی نظر میں ان کی شاعری بے مغز، کھوکھلی اور محض لفظی بازیگری ہے۔ جوشؔ شناسی کا یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ انھیں دو انتہاؤں پر پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس مقالے میں جوشؔ کے مرتبے کا تعین کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے کلام کا فکری وفنی سطح پر جائزہ لینا بلکہ جوشؔ کی قدر و قیمت فیضؔ کی نظر میں کیا ہے! یہ مقالہ اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔

فیضؔ نے جوشؔ پر ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان ہے ''جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے''۔ یہ مضمون فیض کے مجموعۂ مضامین ''میزان'' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں فیضؔ نے جوشؔ کے نظریۂ انقلاب اور ان کی انقلابی شاعری کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ فیضؔ جوشؔ کے انقلابی تصورات سے متفق نہیں تھے۔ فیضؔ کے نزدیک انقلاب اور انقلابی شاعری ایسے الفاظ ہیں جو واضح

نہیں ہیں بلکہ ان میں ابہام پایا جاتا ہے وہ مضمون کا آغاز یوں کرتے ہیں

> ''انقلاب اور انقلابی شاعری مبہم الفاظ ہیں۔ ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب بھی گمراہ کن عقیدہ ہے اس لئے کہ انقلاب کا نتیجہ خیر بھی ہو سکتا ہے اور شر بھی۔ یہ انقلاب کی نوعیت اور مقاصد پر منحصر ہے۔''

انقلاب برائے انقلاب کا نظریہ اس وقت تک گمراہ کن ہوگا جب تک ہم اس کے مقاصد اور اس کی نوعیت کا پتہ لگا کر خیر و شر میں امتیاز نہ پیدا کریں۔ یہ امتیاز محض جذبہ و جنون سے پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کے لئے ایک صحت مند نقطۂ نظر اور منفرد طریقہ کار کا ہونا لازمی ہے۔ فیض لکھتے ہیں

> ''اس خیر و شر میں تمیز کرنے اور صحیح انقلابی تعلیم کی ترویج کے لئے جذبہ و جنون کافی نہیں، فہم و تدبر اور صحت نظر بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ہر ادبی تحریر کے فنی و افادی پہلو تو ہوتے ہی ہیں لیکن انقلابی ادب کا ایک تیسرا پہلو بھی ہوتا ہے یعنی نظریاتی پہلو یا یوں کہہ لیجئے کہ انقلابی ادب کامیاب اور ناکامیاب، مفید اور مضر ہونے کے علاوہ صحیح یا غلط بھی ہو سکتا ہے''۔

فیض کے نزدیک سب سے پہلے اس بات کا تعین کر لینا ضروری ہے کہ انقلاب کا صحیح نقطۂ نظر کون سا ہے لیکن یہ ایک مشکل امر ہے کیونکہ ہر شاعر اپنے نقطۂ نظر کو اہم سمجھتا ہے، اس لئے کسی بھی شاعر کے کلام کا تعین قدر اس کے نظریات کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہئے۔ کوئی بھی فنکار نقاد کے تراشے ہوئے اصولوں کے مطابق کام نہیں کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ناقد اس سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس نے نقاد کے نظریے کے مطابق فن پاروں کی تخلق کیوں نہیں کی؟۔ فیض جوش کے انقلابی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جوش کا نظریۂ انقلاب اشتراکی نظریے سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ اشتراکی عقائد کی روشنی میں ہی جوش کی انقلابانہ روش کا پتہ لگاتے ہیں۔

فیض کو بھی اس بات کی شکایت ہے کہ جوش کے یہاں شخصیت کا تضاد ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک شخصیت نہیں بلکہ دو شخصیتیں کارفرما ہیں جن کی جانب خود فیض نے اشارا کیا ہے۔ فیض نے اپنی اس بات کو مدلل بنانے کیلئے جوش کا درج ذیل شعر پیش کیا ہے

لایا ہوں بزم ورزم کے ارض تضاد سے
یہ طبل جنگ و ساز شبتاں ترے لئے

بزم ورزم کی وارداتیں ایک ہی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر چہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن ان کے درمیان کوئی مطابقت، کوئی ارتباط یا کسی قسم کی وحدت قائم ہونی چاہئے کیونکہ جوش جن نظریات سے منسلک نظر آتے ہیں، ان میں انقلابی نظریہ محض رزم سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا انسلاک بزم سے بھی ہوتا ہے۔ بقول فیض

''ایک صحیح انقلابی شاعر اپنا انقلابی نظریہ محض انقلابی مضامین تک محدود نہیں رکھتا، اس کے لئے حسن وعشق، مناظر فطرت، شراب، ساغر سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں چنانچہ وہ خالص عاشقانہ کیفیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بھی انقلابی شعور کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ بزم شراب کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس بزم کی ہاؤ ہو میں انقلاب کا شوروشغب بھی شامل ہوتا ہے اور جب وہ خالص انقلابی مضامین باندھتا ہے تو وہ بھی بزم کے سرور اور فراق ووصال کے سوز وساز سے یکسر خالی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شاعر اپنی ذات کو انقلابی نظریۂ حیات سے منطبق کر چکا ہے تو اس کے لئے یہ آسانی سے ممکن نہیں کہ ایک لمحے میں وہ خالص سو فیصدی انقلابی ہو اور دوسرے لمحے میں مکمل رند اور فراری۔ یہ جوش صاحب کا کمال کہہ لیجئے یا کمزوری سمجھ لیجئے کہ انقلابی اور رندانہ شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔''

فیض کا خیال ہے کہ اگر جوش کی تمام نظموں کی تقسیم دو حصوں میں کر دی جائے تو ان کی عاشقانہ نظموں کا پلہ بھاری رہے گا لیکن فیض کا مقصد ان کی انقلابی اور عاشقانہ شاعری میں تقابل و موازنہ مقصود نہیں اس لئے وہ جوش کے تصور انقلاب پر ہی اپنی نگاہ مرتکز رکھتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کی کسوٹی پر جوش کے نظریۂ انقلاب کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اشتراکیت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ انقلاب کسی ایک ذات واحد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں

کے باہمی پیکار سے انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ جوش کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا انقلابانہ رویہ اس نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا ہے کیونکہ ان کے یہاں انقلابی تحرک کسی سماجی طبقے کے ذریعے نہیں بلکہ کسی فرد کے ذریعے پیدا ہوتا ہے اور بیشتر مقامات پر وہ فرد کوئی اور نہیں بلکہ خود جوشؔ صاحب ہیں۔ فیضؔ کے مطابق

> ''یہ تصور کہ کوئی ایک فرد یا کوئی ایک شخص انقلاب کو اپنی ذات میں سمیٹ سکتا ہے اور یہ کہ سماجی علل واسباب اس کش مکش میں غیر اہم ہیں قطعاً غیر اشتراکی ہے اور اشتراکیوں کے بقول رجعت پسندانہ ہے۔ وہ ذاتی انکسار اور جماعتی تفخر جو صحیح انقلابی شاعر میں ہونا چاہئے جوشؔ کی شخصیت میں نہیں ہے۔''

اشتراکیت کے سماجی نظام میں محنت کشوں کا طبقہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس طبقے سے ذہنی، جذباتی اور نظریاتی وابستگی ضروری ہے لیکن جوشؔ کے یہاں اس قسم کی مطابقت بھی مفقود ہے۔ اگر چہ جوشؔ نے مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے لیکن اس میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں پیدا کر سکے اور نہ ہی انھوں نے ان طبقات کے مسائل کو بغور دیکھنے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ان مسائل کے اظہار میں سطحیت نظر آتی ہے۔ بقول فیض

> ''وہ کسان اور مزدور کا ذکر اکثر کرتے ہیں لیکن بہت اوپر سے اور مشفقانہ انداز میں۔ انھوں نے اس طبقے کی نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی نہ اس طبقے کے مسائل میں انھیں زیادہ دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔''

فیضؔ جوشؔ کی مشہور زمانہ نظم ''کسان'' کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نظم کسانوں کے متعلق چند رومانی تصورات ۔کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کی لفظیات نوابی درباروں کے قصیدہ گوشعراء کی ذہنیت کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کسان، ہل اوران کے متعلقات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ بالکل اشتراکیت کے منافی ہے۔ فیضؔ کے نزدیک تصور انقلاب کو ان طبقاتی تصورات سے منفک نہیں کر سکتے ہیں یہ سبب ہے کہ فیضؔ کی نظر میں جوشؔ کا نظریۂ انقلاب درست

نہیں ہے کیونکہ انھوں نے محنت کش طبقات سے متعلق اپنے نظریات کی تہذیب و تنظیم نہیں کی۔ اس بحث سے قطع نظر فیض یہ بھی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

''اس ساری بحث سے یہ مراد نہیں ہے کہ جوش کا انقلابی یا ترقی پسند کلام نظریاتی اعتبار سے بالکل نا قابل اعتنا ہے۔''

اگر چہ فیض جوش کی انقلابیت سے کسی قدر اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن اس یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ فیض جوش کے خلاف تھے درست نہیں ہے۔ جوش سے نظریاتی طور پر وہ متفق نہ ہوں لیکن وہ کلام جوش کی افادیت کے منکر نہیں تھے۔ انھیں جوش کی قادرالکلامی، بے باکی اور جرات رندانہ کا احساس پوری طرح تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے فیض ایک انٹرویو کے دوران جوش کے بارے میں کہتے ہیں

''بھئی ان میں خاص قسم کا ایک وفور اور ایک خاص قسم کی قدرت کلام ہے۔ اس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارا نہیں لیکن وہ بہت پر گو ہیں۔ غالباً قدرت کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور برے اور بالکل خالص یا کہئے کم خالص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے اور احتیاط نہیں کرتے تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیز ہیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں محض زور کلام میں کہی گئی ہیں۔''

یہ بات صحیح ہے کہ جوش کے یہاں الفاظ کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جو اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں نہیں آتا ہے لیکن ہم جوش کی شاعری کو محض لفاظی کہہ کر رد کر سکتے ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ کثرت الفاظ کی وجہ سے ان کے یہاں ایسے بھی مقامات آتے ہیں جہاں وہ لفظوں کے استعمال میں محتاط نظر نہیں آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات خراب الفاظ بھی استعمال میں لائے گئے ہیں لیکن اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے بہت سے الفاظ کو نئے معنی دئے ہیں اور انھیں

نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ جوشؔ سودا کی روایت کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی و ادبی رشتہ فارسی و ترکی کے خطیبانہ اور بلند بانگ روایت سے تھا۔ جوشؔ کا کہنا تھا کہ ان کا مزاج ٹرکین سے عاشقانہ تھا لیکن فیض کے نزدیک ان کا مزاج عاشقانہ کے ساتھ ہی جارحانہ بھی تھا اور انھیں دو صفات سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کی عاشقانہ اور انقلابانہ شاعری میں جارحانہ عناصر کارفرما ہیں اور انھیں جارحانہ عناصر کی بنیاد پر ان کے یہاں جدال وقتال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش کے جذبات میں اتنی شدت ہے کہ وہ اظہار پر کنڑول نہیں کر پاتے ہیں اور اپنے احساسات کو اسی قوت اور توانائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس قوت کے ساتھ وہ انھیں محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے احساسات کے اظہار میں لطافت کم اور متشددانہ لہجہ زیادہ ملتا ہے۔ بقول فیض

> ''جوشؔ صاحب کو حدیث دل کی نزاکتوں اور داخلی احساسات کی لطافتوں سے بہت کم واسطہ تھا۔ اسی طرح ان کی شاعرانہ لغت اور لہجہ میں بھی لوچ کے بجائے گھن گرج اور طنطنے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ بیشتر بڑے کینوس پر موٹے برش سے آئل پنٹ کرتے تھے۔''

اس کے باوجود فیضؔ جوشؔ کی عظمت شعری پر یقین رکھتے تھے۔ جوشؔ کی زبان دیبان پر گرفت اور ان کے استعمال کے ہنر کا احساس بھی فیضؔ کو تھا۔ جوشؔ کے یہاں انقلاب کا کوئی منضبط تصور تھا یا نہیں؟ اس کا جائزہ ہمیں دنیا کے انقلابی مفکرین کے تصورات کو پیش نظر رکھ کر نہیں لینا چاہئے بلکہ انیسویں یا بیسویں صدی کے انقلابی شعراء سے ہی جوشؔ کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

جوش کا سنہ ولادت۔ایک مختصر تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر ہلال نقوی

جوش صاحب انیسویں صدی کے آخری عشرے میں پیدا ہوئے، باقی تمام زندگی بیسویں صدی میں گزری لیکن عمر کی اس مسافت کے باوجود ان کی زندگی میں ان کے سنہ ولادت کا حتمی طور پر تعین نہیں کیا جا سکا۔ ان کی وفات کو بھی تقریباً ربع صدی گزر چکی ہے لیکن اب تک ان کے سنہ ولادت کے متعلق بالکل یقینی طور پر کچھ نہیں کہا گیا۔ اس ذیل میں نہ کوئی منضبط تحقیق ہوئی نہ ان کے خاندانی دستاویزات کی چھان پھٹک کی گئی۔ یہ بات تو یقیناً طے ہے کہ ان کی ولادت انیسویں صدی کے آخری عشرے میں ہوئی۔ لیکن سنہ کون سا تھا۔ ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک جتنے بھی سنہ ہیں ان میں سے ہر سنہ کو ان کے سن ولادت سے منسوب کر دیا گیا۔ نتیجتاً اتنے مغالطے پیدا ہوتے چلے گئے کہ یہ موضوع ہی الجھ گیا۔ تمام مغالطے پیدا کر دینے میں دیکھا جائے تو سب سے بڑا ہاتھ خود جوش صاحب کا ہے۔ انہوں نے یقیناً دانستہ ایسا نہیں کیا۔ سنہ ولادت کے متعلق انہوں نے جب بھی اظہار کیا اس میں نادانستہ طور پر مختلف سن کے وہ نام لیتے رہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا مزاج عالمانہ تو رہا لیکن دو اور دو چار والا محققانہ کبھی نہیں رہا۔ خصوصاً ایسی تحقیق جس میں اعداد و شمار زیر بحث ہوں ایسے روکھے موضوع سے تو ان کے شاعرانہ اطوار کا کوئی ذہنی تعلق قائم ہی نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر جب راقم السطور نے اپنے تحقیقی مقالے کی تشکیل کے دوران ان کی رثائی تخلیقات کے سنہ تصنیف ان سے دریافت کیے تو انہوں نے اپنے خط میں جواب دیا:

''تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت پر
بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں۔''[1]

یہاں ایک جائزہ لے لیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سنہ ولادت کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ جو بھی اظہار کیا، وہ کب کیا۔ کس پس منظر میں کیا اور اس بارے میں انہوں نے کیا بتایا۔

جوش کے بیان کردہ مختلف سنہ ولادت

۱۔ ۱۹۳۳ء میں جوش صاحب نے ،،بہن کی یاد،، کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

جیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش چھتیس سال۔ (۲)

اس اعتبار سے ان کا سنہ ولادت ۱۸۹۷ء ہونا چاہیے۔

۲۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ انہی دنوں میں ان کے دل میں جوش صاحب پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ کتاب کا خاکہ تیار کرنے کے دوران اپنے مباحث کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے کچھ سوالات جوش صاحب کو لکھ کر دیئے۔ جوش صاحب نے بھی ان کے جوابات تحریراً دیئے اس کے بعد احتشام صاحب نے پہلی بار ان کا جو سنہ ولادت بتایا وہ ۱۸۹۶ء تھا۔ (۳)

۳۔ ۱۹۴۸ء میں جوش صاحب نے 'جلال و جمال' کے عنوان سے بائیس بندوں پر مشتمل ایک نظم لکھی جس کے گیارہویں بند (۴) کے ابتدائی دو مصرعے یہ ہیں:

انچاسویں برس میں ہے گو عمر کا قدم
دل میں وہی تڑپ ہے وہی ولولوں میں رم

اگر ۱۹۴۸ء میں وہ انچاس برس کے ہوئے تو سنہ ولادت ۱۸۹۹ء ہونا چاہیے۔

۴۔ جوش صاحب کی زندگی میں 'افکار' کا اک ضخیم جوش نمبر ۱۹۶۱ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے مدیر صہبا لکھنوی نے بڑے فیصلہ کن انداز سے حتمی لہجے میں یہ بات لکھی:

''اردو رسالوں اور ادبی تاریخوں میں آج تک جوش کا سنہ پیدائش ۱۸۹۶ء

اور مقام پیدائش کنول ہار شائع ہوتا رہا ہے، جو غلط ہے ثبوت کے طور پر جوش
کی تحریر کا عکس پیش ہے۔ یہ ان کے مسودات سے ہم نے حاصل کیا ہے۔'' ۵

اس عکس تحریر پر جوش صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ تاریخ کہ جب انہوں نے یہ معلومات درج کی تھیں، وہ ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء دہلی۔ یعنی انہوں نے جب ۳۹۔۱۹۳۸ء میں احتشام صاحب کو سنہ ولادت بتایا تو ۱۸۹۶ء بتایا اور اس کے ایک سال بعد ہی ان کی تحریر میں ۱۸۹۸ء لکھا ہوا ملتا ہے۔ اسی بنیاد پر صہبا لکھنوی نے ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو صحیح تاریخ و سنہ پیدائش قرار دیا۔ لیکن ماہنامہ 'افکار' کے اسی شمارے میں 'جشن جوش' کا بھی ذکر ہے۔ جس کا انعقاد ۵ نومبر ۱۹۶۱ کو ہوا۔ اس جشن کو ان کی ۶۵ ویں سالگرہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس حساب سے سنہ ولادت ۱۸۹۶ء ہوتا ہے۔

۵۔ روز نامہ حریت کراچی کے سابق ایڈیٹر انور خلیل نے 'افکار جوش نمبر' کی اشاعت کے بعد جوش صاحب کے گھر پر ان سے ایک ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں انہوں نے جوش صاحب کے بچپن کی ایک تصویر دیکھی۔ جس کے نیچے خود جوش صاحب کی تحریر میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے:

''یہ تصویر ۱۹۰۷ء کی ہے جب میری عمر ۱۵/ یا ۱۶/ سال تھی۔'' ۶

اس طرح تو ان کا سنہ ولادت ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء ہوا۔

۶۔ ماہنامہ افکار کے ۱۹۶۱ء کے جوش نمبر میں جوش صاحب ہی کی تحریر میں ان کا سنہ ولادت جو ۱۸۹۸ء شائع ہوا تھا وہ ۲۱ سال بعد صہبا لکھنوی نے اپنے جریدے کے بیاد جوش نمبر میں پھر شائع کر دیا (۷) اور اس دعوے کیساتھ شائع کیا کہ یہ جوش صاحب کے مستند ترین حالات ہیں یعنی ان کی زندگی میں شائع ہونے والے جوش نمبر میں بھی انہوں نے اسی سن ولادت کو اولیت دی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کا اصرار اسی سنہ ولادت پر ہے لیکن افکار بیاد جوش نمبر سے بارہ سال پیشتر یعنی ۱۹۷۰ء میں جب جوش صاحب کی خودنوشت منظر عام پر آئی تو اس میں انہوں نے ۱۸۹۸ء کے بجائے ۱۸۹۶ء کو ترجیح دی اور وہ بھی اس زاویۂ فکر کے ساتھ:

''میں، اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ
زندان کون و فساد میں اوبھنے کے واسطے کب لایا گیا، اس امر کو صحت کے
ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ

ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورّخ تھیں، مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا۔ وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا، یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے، اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ دو برس اور بوڑھا ہو گیا، ہو جانے دیجئے (جوتی کی نوک سے)۔ البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔''۸

۷۔ جوش صاحب کی وفات کے ۱۱ رسال بعد مئی ۱۹۹۳ء میں ان کی پوتی تبسم اخلاق نے اپنے دادا کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کی جو فوٹو اسٹیٹ نقل مجھے فراہم کی اس میں شناختی کارڈ پر جوش صاحب کی عمر ۷۴ سال لکھی ہے۔ یہ کارڈ ۱۶ رجنوری ۱۹۷۴ء کو اسلام آباد / راولپنڈی کے شناختی کارڈ آفس سے جاری ہوا ہے۔ اس لحاظ سے تو سنہ ولادت ۱۹۰۰ء ہونا چاہیے۔

۸۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ پر عموماً شخصی معلومات کا اندراج یکساں ہی ہوتا ہے ورنہ سفری ضروریات اور بعض دوسری اسناد کی صحت و تصدیق کی راہ میں کئی مشکلات آڑے آجاتی ہیں۔ لیکن جوش صاحب کے سنہ ولادت کا اظہار ان کے شناختی کارڈ سے ۱۹۰۰ء ہوتا ہے جبکہ پاسپورٹ پر ۱۸۹۸ء درج ہے۔ یہ پاسپورٹ ۷ر اپریل ۱۹۷۰ء کو بنا۔

جوش صاحب کے سنہ ولادت کے ذیل میں مندرجہ بالا تمام اطلاعات اور بیانات میں واضح تضاد نظر آرہا ہے اور کیونکہ ان کی زندگی میں اور ان کی زندگی کے بعد بھی تحقیق کرنے والوں نے ان کے سنہ ولادت کو موضوع تحقیق ہی نہیں بنایا تو اکثر و بیشتر لکھنے والے انہی سنین کو بنیاد بناتے رہے جن کی نشاندہی جوش صاحب نے کی تھی۔ ماہنامہ افکار کا ضخیم جوش نمبر اور یادوں کی برات کیونکہ سب کے لئے سہل الحصول تھے اور جوش صاحب کے سلسلے میں سب سے زیادہ انہی کو پڑھا گیا۔ چنانچہ ان میں لکھے ہوئے دونوں سنہ ہی برابر نقل کیے جاتے رہے۔ اس موقع پر بزرگ محققین سے لے کر آج کے نوجوان محقق تک کی متعدد تحریروں سے حوالے دیئے جا سکتے ہیں جنہوں نے جوش صاحب ہی کی بیان کردہ مختلف تاریخوں اور سنہ کو ان کا سنہ ولادت تسلیم کیا ہے اور وہ کسی کرید اور چھان بین کے سفر

پر نہیں نکلے۔ لیکن اس موضوع کو مزید طوالت سے بچانے کے لیے فی الوقت ان تمام حوالوں سے گریز کیا گیا ہے۔

ترقی پسند احوال وافکار کی ترویج واشاعت سے وابستہ ارتقا ادبی فورم کراچی نے ۱۹۹۸ء میں 'جوش صدی تقریبات' کا پورے پاکستان میں اہتمام کیا۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب کے نظریاتی ہم خیال ایک بڑے فورم نے بھی ان کے سنہ ولادت کو ۱۸۹۸ء ہی تسلیم کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جوش صاحب کے صحیح سنہ ولادت کا تعین کیا جائے تو کیوں کر کیا جائے اور کن حقائق کو بنیاد بنا کر ہم کسی ایک سنہ کو طے کرلیں۔ یہ اس طرح نہیں ہوگا کہ ملیح آباد سے اچانک ایسی دستاویز دریافت ہو جائے جس پر جوش صاحب کے آباؤ اجداد کی کوئی یادداشت اس گتھی کو سلجھا دے۔ ایک تو اس زمانے میں، یہ رواج ہی نہیں تھا کہ شخصی حالات لکھ لیے جائیں۔ دوسرے یہ کون کہہ سکتا تھا کہ جس بچے نے دنیا مین جنم لیا ہے آنے والے وقتوں میں ناموری کا تاج اس کے سر پر ہوگا۔ چنانچہ روز اول سے اس کی زندگی کے ہر اہم لمحے کو نوٹ کرلیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں بعض ایسی شہادتوں اور تحریروں کو بنیاد بنانا ہوگا جو جوش صاحب کی زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہوں کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دور آغاز میں جو حالات و واقعات قلمبند کئے جاتے ہیں وہ سب خاندان کے بزرگوں کی نظروں میں ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے ذاتی بیاضوں میں کچھ باتیں نوٹ کر بھی لی ہوتی ہیں تو وہ اس وقت تو محفوظ ہوتی ہیں مگر گزرتے وقت کے ساتھ یہ سب حقیقتیں گرد آلود ہوتی جاتی ہیں اور حقائق نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ کسی عام آدمی سے متعلق ایسی معلومات کا حاصل کرلینا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے اطراف میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً کسی علمی وادبی حوالے سے وہ معروف ہے تو پھر کہیں نہ کہیں اس کے حالات محفوظ ضرور ہو جاتے ہیں۔ پرانے تذکروں کی اہمیت کا سب سے بڑا راز ہی یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے اہل قلم اور اہل سخن کے بنیادی تعارف سے ہمیں آگاہ کر دیتے ہیں۔

اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ صاحب نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ ان کے نوادرات میں شعرائے ملیح آباد کا ایک ایسا قلمی تذکرہ موجود ہے جو بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں لکھا گیا اور جس میں شبیر حسن خان (جوش) کے بھی مختصر احوال ہیں۔ میرے

اصرار پر انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ کسی فرصت کے وقت میں یہ نایاب تذکرہ مجھے دکھا دیں گے لیکن وہ اچانک انتقال کر گئے اور اس غیر مطبوعہ نادر تذکرے سے استفادے کا موقع نہیں مل سکا۔

صحیح سنہ ولادت

جوش صاحب کے صحیح سنہ ولادت کے ذیل میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'روح ادب' انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ میری مراد اس نسخے سے ہے جو میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا۔ نسوانی حسن کی خیالی تصویروں سے آراستہ یہ نایاب نسخہ جوش صاحب سے میں نے ان کے دستخط کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ ان کے تمام شعری مجموعوں میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کا مقدمہ محمڈن کالج علی گڑھ اور کیننگ کالج لکھنؤ کے سابق پروفیسر رفیع احمد خان نے لکھا تھا جس میں پہلی بار جوش صاحب کے نام و نسب' مختصر حالات زندگی، بچپن، تعلیم و تربیت، آغاز شعر گوئی اور عادت و اطوار کا بھی تذکرہ ہے۔ جس میں یہ تک نشاندہی کی گئی ہے کہ جوش صاحب نے دس سال کی عمر میں کون سے شعر کہے اور گیارہ سال کی عمر میں کون سے۔ اتنی ترتیب اور اتنی تحقیق کے ساتھ لکھے جانے والے اس مقدمے میں پہلی بار مقدمہ نگار نے ان کے سنہ ولادت کا بھی اظہار کیا ہے جو ۱۸۹۴ء ہے۔ (۹) اس مقدمہ میں ایک اور مقام پر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس وقت جوش صاحب کی عمر چھبیس سال ہے۔ (۱۰) اس مستند تاریخ ولادت کا حوالہ بعد کے محققوں کے یہاں اس لیے بھی نہیں آ سکا کہ روح ادب کا یہ نسخہ کچھ ماہ بعد ہی نایاب ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں مکتبۂ اردو، لاہور، نے جب اسے دوبارہ شائع کیا تو اس میں رفیع احمد خان کا مقدمہ نہیں تھا۔ دیباچے کے طور پر جوش صاحب کی ایک تحریر ضرور شامل تھی۔

اس سنہ ولادت کی انتہائی قریبی شہادتوں میں جوش کی پہلی نثری کتاب 'مقالات زریں' بھی بہت اہم ہے۔ یہ روح ادب کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی اور روح ادب کے پہلے نسخے ہی کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ جوش صاحب کے اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ اقوال مختلف جذبات و احساسات کی ایک ایسی مرصع شکل ہیں جن میں ندرت فکر بھی ہے اور ندرت اظہار بھی۔ اظہار کا ایک یہ زاویہ بھی دیکھئے جس سے ہم ان کے سنہ ولادت کو اخذ کر سکتے ہیں:

''جوش ازل سے تجھ پر فریفتہ ہے۔اب وہ ستائیسویں برس میں قدم رکھ رہا ہے۔گویا تیرے عشق کی ستائیسویں سالگرہ ہے۔''[11]

۱۹۲۱ء میں بھی ستائیسویں سالگرہ کا ذکر ۱۸۹۴ء ہی کی نشاندہی کر رہا ہے۔یوں رفیع احمد خاں کے بعد خود جوش صاحب نے بھی اسی سنہ ولادت کو اپنا حقیقی سنہ ولادت تسلیم کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا۔مگر بعد کی تحریروں میں وہ اسے بھول گئے۔گنتی کے دو چار لکھنے والوں نے بھی اپنی کسی تحریر میں یہ سنہ لکھا ہے لیکن وہ ان کی کسی بحث کا حصہ نہیں ہے۔جوش صاحب پر لکھتے ہوئے ان کا سنہ ولادت بھی لکھنا تھا، سو لکھ دیا۔البتہ ڈاکٹر ناہید عارف جنہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے تحت خاندان گویا کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھا اور جو خود بھی اسی خاندان سے ایک نسلی تعلق رکھتی ہیں۔۱۸۹۴ء ہی کو ترجیح دیتی ہیں اور وہ بھی روح ادب مطبوعہ ۱۹۲۰ء میں رفیع احمد خان کے لکھے ہوئے مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے یہی بات کہتی ہیں کہ:

''۱۹۲۰ء میں جوش کے متعدد بزرگ زندہ تھے۔ظاہر ہے کہ رفیع احمد خان نے جوش اور ان کے بزرگوں سے معلوم کر کے ہی ان کا سنہ ولادت لکھا ہوگا۔''[12]

جوش صاحب کے سنہ ولادت سے متعلق اس مختصر جائزے کے بعد اور آج تک کے تمام تحقیقی شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جوش صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۹۴ء ہے۔وہ ملیح آباد کے قصبے مرزا گنج میں پیدا ہوئے۔اس روز دسمبر کی پانچویں تاریخ تھی۔

حوالہ جات

۱۔مکتوب جوش بنام ہلال نقوی مرقومہ ۱۷رجون ۱۹۸۱ء اسلام آباد مشمولہ جوش ملیح آبادی کے خطوط۔مرتبہ خلیق انجم، ثمر آفسٹ پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۳/۱۷۴

۲۔جوش ملیح آبادی۔نقش و نگار۔مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۸

۳۔پروفیسر احتشام حسین، 'جوش ملیح آبادی انسان اور شاعر' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۔

۴۔جوش ملیح آبادی 'سرود خروش'، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۲۹۷

۵۔ صہبالکھنوی ’جوش ملیح آبادی زندگی، شخصیت اورفن کا جائزہ‘، افکار جوش نمبر پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷

۶۔ انور خلیل۔ جوش کا ایک یادگار انٹرویو، مشمولہ افکار بیاد جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۸۷

۷۔ صہبالکھنوی جوش ملیح آبادی زندگی، شخصیت اورفن کا مستند جائزہ‘، مشمولہ ماہنامہ افکار بیاد جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۲۹

۸۔ جوش ملیح آبادی ’یادوں کی برات‘ جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۴۱

۹۔ رفیع احمد خاں۔ مقدمہ روح ادب، میتھوڈسٹ پریس لکھنو، ۱۹۲۰ء، ص ۱۵

۱۰۔ ایضاً ص ۱۹

۱۱۔ جوش ملیح آبادی ’مقالات زرّیں‘، اصح المطابع تھوی ٹولہ لکھنو ۱۹۲۱ء، ص ۵۵

۱۲۔ ڈاکٹر ناہید عارف ’گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات ۱۹۲۰ء تک‘ نامی پریس ۱۹۸۹ء، ص ۳۸۱

☆☆☆

تجزیہ

جوش کی نظم ''البیلی صبح'' کا عملی تجزیہ

پروفیسر سید محمد عقیل

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھر تھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، پری کوئی مسکرا رہی ہے
سحر کو مد نظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خون فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنیوالی، لہومیں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلو سکھا رہی ہے
فلک پہ اسطرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر، چٹکتی کلیو، ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آرہی ہے

عملی تنقید

مجھے افسوس ہے کہ میں مصور نہیں ورنہ اس بحث کے آغاز سے پہلے ایک تصویر، ایسی عروس نو کی بنا دیتا جو صبح کو اپنی رونمائی کے لئے سسرال میں سر جھکائے ہوئے ایک سجے تخت پر بیٹھی ہے۔ پھر اس نظم کی تفہیم میں بہت سی آسانیاں ایسی پیدا ہو جاتیں جن میں دیگر حواس خمسہ کے ساتھ ساتھ قوت باصرہ کو بطور خاص دخل ہوتا کہ ذہن، عقل اور محسوسات جیسے قویٰ کے ساتھ قوت باصرہ اگر شامل ہو سکے تو تفہیم شعر میں بہت دل چسپ گوشے پیدا ہو سکتے ہیں اور قارئین شاعر کی فکر کی تمام جہتوں کو دیکھ سکتے ہیں یا دیکھنے کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ جوشؔ کی یہ نظم ''البیلی صبح''، جس کی عملی تنقید پیش کی جارہی ہے، کچھ اسی طرح کی نظم ہے۔

البیلی صبح کی Opening Lines مصوری کی اسی کوشش سے نظم کا آغاز کرتی ہیں۔

نظر جھکائے عروس فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

اس شعر کا کلیدی لفظ عروس ہے جس کے مددگار الفاظ ''جبیں''، ''زلفیں'' اور ''ہٹانا'' ہیں۔ ''فطرت'' اور ''نظر جھکائے'' اس تصویر یا خیال کی تکمیل کے لئے آئے ہیں۔ اب تصویر تفصیل اور تکمیل کی طرف بڑھتی ہے۔ میں نے ''تصویر'' کا لفظ دائروی تکمیل (Peripheral Completion) کے لئے استعمال کیا ہے۔ محسوسات اور فیلنگ کے لئے نہیں کیوں کہ محسوسات اور فیلنگ دوسرے مصرعے میں اپنی کیفیات کے لئے جلوہ گر ہوتے ہیں اور اس کے اظہار کے لئے شاعر نے ''زلزلے'' اور ''تھرتھرا رہی ہے''۔ کے حسی پیکر رکھنے والے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ''سحر کا تارا''، نو عروس کا چہرہ بھی ہو سکتا ہے جس پر ''خوشی''، ''ندامت''، ''تحیر''، اور ''شرم'' سے ایک رنگ آتا، ایک رنگ جاتا ہے اور اس طرح ''سحر کا تارا'' ایک خاص اشاریت کو مکمل کرتا ہے۔ ''زلزلہ'' ایک طرح سے جذبات کا ایک بھونچال ہے۔ اگر ''افق'' کو ''ہونٹ'' فرض کر لیا جائے تو ''تھرتھراہٹ'' کا بصری پیکر جو شاعر

کے ذہن میں رہا ہوگا، اس کی بھی تفہیم ہو سکتی ہے۔ یہ باتیں اس لئے ابتدا میں کہی جا رہی ہیں تا کہ نظم کا ایک تصویری بیانیہ ڈھانچہ پہلے بن جائے اور پھر اس فریم ورک میں اس نظم کا تجزیہ کیا جا سکے۔

اب اس نظم میں شاعر نے جو گلاسری (Glossory) استعمال کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔ ذرا دیکھا جائے کہ گلاسری اس غیر مرئی تصویر میں رنگ بھرنے میں کیا مدد کرتی ہے۔ گلاسری یوں ہے۔۔۔ البیلی، عروس، جبیں، زلفیں، تھرتھراہٹ، نغمۂ طرب، جشن رنگ دبو، غزل خواں، کلی، گنگنانا، رسیلی جھپکتی آنکھیں، نگار مہتاب، نشیلی نگاہ، جادو جگا رہی ہے، مطرب، لچک، گانا، سہیلی، جھولا جھلانا، بیلے کی کلی، ہیرے کی کیل پہنے ہوئے پری، مسکرانا، گلابی شلوکا سبک، رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی، پلو، نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑانا، چٹکتی کلی، گلشن کی نرم روکس کی آواز؟ (جس میں تغزل کی سوالیہ اشاریت شامل ہے)

اوپر سے جوشؔ کی اس نظم کی جو تصویر بنی شروع ہوئی ہے، اس میں الفاظ کا یہ سٹ ایک طرف تو عروس نو کے سارے لوازم کو نہ صرف متشکل کرتا ہے بلکہ متحرک بھی۔ دوسری طرف ان الفاظ سے نظم کی ایک خاص فضا بنتی ہے جس کی پہلی شکل بیرونی حلقے (Outer Ring) کی ہے یعنی سامع یا قاری اولاً الفاظ کی خارجی صورتوں سے جوشؔ کی اس بنتی ہوئی تصویر کے قریب پہنچتا ہے اور پھر الفاظ کے موجودہ انحراف اور ٹکراؤ سے جملوں کے اندر سے محسوسات کی حدوں میں داخل ہونے لگتا ہے۔ اس صورت کو شعری زبان کی لسانی تفہیم میں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے دائروں (Peri-Pheral) استعمال او کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ جسے عملی تنقید کے ماہرین نے Generation with in the "poem" کہا ہے۔ اس طرح عروس نو کی تصویر متشکل ہوتی نظر آتی ہے۔ تمام لوازم پورے ہیں جو اس طرح کے الفاظ کے سٹ سے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد توضیح شروع ہوتی ہے مگر یہ توضیح اپنے فریم ورک سے الگ نہیں ہوتی۔ صرف اس کے مرکزی خیال کی توسیع بنتی ہے۔ نظم کے بیان میں یعنی Statement میں بھی فرق نہیں آتا۔ اور تصویر کی اکائی (Unit) بھی نہیں بگڑی۔

''طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے''

یہ مصرعہ اور اس کا پہلا مصرعۂ معنوی فضا میں شگفتگی کی لہریں بناتا ہوا، تصویر کے Unit میں جڑ جاتا ہے۔ اگر چہ ''ہیں غزل خواں'' لسانی ڈھانچے میں علم قواعد کی نچلی سطح۔ Lower order of

Grammarticalness ہے۔ مگر اس سے نظم کی شگفتگی متاثر نہیں ہوتی۔ مگر یہ لسانی بناوٹ (Structure) کی بات ہے۔ ہم ابھی تصویر کی توسیع یا اضافے کی مختلف صورتوں کی بات کر رہے ہیں۔ لسانی بناوٹ کی بات بعد کو ہوگی۔

''ستارۂ صبح کی رسیلی، جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے''

یہ مصرعہ اپنی تصویر الگ بناتا ہے اور ''نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے''۔ یہ اگرچہ پہلے مصرعے سے منسلک تصویر ہے، مگر اس کا ہالہ الگ سے بنتا ہے۔ ان میں انسلاک کی صورتیں دو ہیں:

(۱) ستارہ اور مہتاب۔

(۲) ''رسیلی جھپکتی آنکھوں کے فسانے'' اور ''نشیلی نگاہ کا جادو جگانا''۔ پہلے مصرعے کو موسیقی کی اصطلاح میں High Key کہہ سکتے ہیں اور دوسرے میں ایک نشیبی روانی ہے۔ یہ Low Key نہیں ہے۔ اس طرح صاف صاف دو پیکر بنتے ہیں اور یہ پیکر بھی اس بڑی تصویر کے یونٹ (Unit) بن کر اسی میں جڑ جاتے ہیں۔ پھر یہ شعر آتا ہے:

طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

نظم کا یہ شعر بڑی تصویر کا تزئینی حصہ (Decorative Part) ہے مگر اس کا یونٹ نہیں ہے۔ اس شعر سے وہ ماحول بنتا ہے۔ جو کسی بھی صبح کے ساتھ کسی سرزمین میں لگایا جا سکتا ہے۔ مزید غور کیا جائے تو اس کیفیت کے ساتھ صبح کی شرط بھی نہیں۔ ہاں کسی حد تک موسم (Weather) کی شرط ہو سکتی ہے۔ تھوڑے حشو و زوائد بھی یہاں شامل ہو جاتے ہیں۔ طیور صرف شاخوں ہی پر کیوں گا رہے ہیں؟ کسی بھی شاخ پر گا سکتے ہیں۔ پھر پہلے طیور بیٹھیں گے، بعد کو شاخ لچکے گی۔ ''لچکتی شاخیں'' شاعر کے ذہن کا Presumption پیش کرتی ہیں۔ لچکتی شاخیں پہلے سے موجود نہیں۔ لچکنے اور ہلنے میں جو فرق ہے اسے بھی سمجھتے رہنا چاہئے۔ یہ تخیل کا مغالطہ ہے۔ اپنے لئے بھی اور سامع و قاری کے لئے بھی۔ یہ تصویر اپنے میں مکمل ہو سکتی ہے مگر البیلی صبح کی عروس فطرت کا یونٹ نہیں۔ ہاں اگر ''لچکتی شاخوں'' سے بڑی تصویر کی کمر کی نزاکت متصور ہے تو یہ شعر پھر یقیناً، تصویر کا یونٹ بن جائے گا۔ مگر یہ یونٹ، براہ راست نہ بنے گا بلکہ ٹوٹی پھوٹی پیکریت Broken Image کے سہارے سے بنے

گا۔

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے

پہلا مصرعہ صرف سادہ بیان (Plain Statement) ہے۔مگر ''نہیں'' کے لفظ کے ساتھ شاعر سادہ بیان چھوڑ کر امیج (Image) کی دنیا میں اترتا ہے مگر کس طرح؟ پری کے پیکر کے ساتھ جو ہیرے کی کیل پہنے ہے۔ یہ شعر بڑی تصویر کا یونٹ ہے۔مکمل یونٹ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ یونٹ تصویر کا چہرہ بنتا ہے۔'کیل' کے ساتھ ساتھ، ناک، ہونٹ، اور چہرے کے تمام خدوخال متشکل ہوتے نظر آتے ہیں۔ذرا آنکھ بند کر کے چشم تصور سے اس شعر کو دیکھئے تو، اس بیان کی صداقت واضح ہوگی۔
اگلا شعر فریم ورک سے بالکل الگ ہو جاتا ہے لیکن بعد کا شعر:

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے

پھر تصویر کو مکمل کرنے لگتا ہے۔پنکھڑی کا گلابی شلوکا، بیان (Statement) بھی ہے اور امیج بھی۔ اس میں نظم کا بیرونی دائرہ بھی ہے اور تغزل کے ہالے بھی۔ اور دوسرا مصرعہ، متحرک پیکر تراشی (Moving Image) کی بڑی اچھی مثال ہے۔ یہ دونوں مصرعے بھی مل کر تصویر کی تجسیم کرتے ہیں۔''ہوا میں پلو سکھانے'' میں دور اور تہذیب دونوں شامل ہو گئے ہیں۔آج کے دور میں یہ امیج، کچھ وضاحتوں کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ ''پلو سکھانے یا دوپٹہ سکھانے'' کا طریقہ اب بدل گیا ہے۔اب آپ کہیں گے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچادی، ورنہ متمول سوسائٹی اور ٹکنوکریسی کے دور میں، مڈل کلاس کو بھی پلو سکھانے، کی ضرورت نہیں۔صرف پرانے گھرانے، اس دور اور تہذیب سے واقف ہیں۔اس طرح یہ مصرعہ متحرک بھی ہے اور تہذیبی اعتبار سے ماضی کی تاریخ بھی۔تاہم اس مصرعے کا متحرک پیکر (Moving Image) مکمل ہے۔ایک دل چسپ چیز اور ہے کہ یہ تحرک افقی ہے جس سے یہ متحرک امیج، پلو سکھانے میں ایک طرح سے رقص کا دائرہ بنا لیتی ہے۔

یہاں ایک بات کی طرف دھیان جاتا ہے کہ اس طرح کی توجیہات، کچھ لوگوں کو عجیب و غریب معلوم ہو سکتی ہیں کہ نظم میں یہ سب باتیں کہاں ہیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ لیکن یہ بھی تو دیکھئے

کہ تمام باتیں نظم کے الفاظ اور جملوں ہی سے پیدا کی جارہی ہیں۔ ایسا مطالعہ، ایک طرح سے شاعر کے ذہن کا ایسا مطالعہ ہے جو براہ راست نہیں مگر ذہن کے لاشعور میں اگر یہ سب باتیں نہیں تو یہ تصویر موڈ اور طرق گفتار اسی طرح کیوں ہوتا ہے؟ شاعر یا ادیب بقول حالؔی ''کائنات کا مطالعہ جب کرتا ہے تو سب کچھ ذہن میں رکھ لیتا ہے۔'' جن میں بہت سی جزوی باتیں بھی ہوتیں ہیں جو بعد کو اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ پھر لاشعور مطالعے کے ساتھ ساتھ، اپنے گرد و پیش سے جو کچھ روایت اور طریق اظہار کے طور پر اپنائے رہتا ہے، شعری اور ادبی اظہار کے وقت اس کا بھی انکشاف کرتا رہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جوشؔ کی اس نظم کی اور تہیں بھی کھلیں۔ جن کا اس مقالہ کے مصنف کو اپنی کم علمی کے باعث پتہ نہیں۔ یہ بات بطور جملہء معترضہ کے کہی گئی۔ پر جس نے بھی شعر و ادب کو تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس'' سے آگے بڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے دور کے لحاظ سے، اس کی تفہیم کے لئے تمام امکانی صورتوں پر بحث بھی کی ہے۔ شبلؔی نے شعر العجم میں محاکات پر بحث کرتے وقت اسی طرح کی بحثیں اٹھائی ہیں۔ اسی طرح مغربی ناقدین نے بھی شعری پیکر تراشی (poetic Image) پر جب بحثیں کی ہیں تو ان کی معنویت اور مختلف الجہتی کے تمام امکانات تلاش کئے ہیں۔

جوشؔ کی نظم البیلی صبح کے مطالعے کے لئے امیجز کی جو بحث اوپر اٹھائی گئی ہے، مغربی ناقدین میں سی۔ ڈے۔ لیوس (C.Day Lewis) نے بھی اپنی کتاب (Poetic Image) میں اسی طرح کی بحث اٹھائی ہے۔ اس نے بھی نظم میں امیجز کو الگ الگ نہیں مانا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی نظم میں بنتی ہوئی امیجز کسی بُری امیج کی تکمیل ہیں اور انھیں الگ سمجھنا مناسب نہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یا تو یہ میجز اپنے فکری لگاؤ سے نظم کی بڑی امیج سے بندھی ہوتی ہیں یا پھر یہ چھوٹی چھوٹی امیجز وہ الاسٹک (Elastic) ہیں جو بڑی امیج سے کھینچ کر یہاں تک تان دی گئی ہیں۔ مگر نظم کی اصل امیج سے الگ نہیں ہوتیں جیسا کہ انگریزی کے رومانوی شعراء کے یہاں۔ اس طرح کوئی چاہے تو جوشؔ کی اس نظم کے مختلف ٹکڑوں کو جسے میں نے یونٹ (Unit) کہا ہے۔ سی۔ ڈے۔ لیوس کے اصول کے مطابق ''توسیع'' (Extension) کہہ سکتا ہے۔ اب اس نظم کی آخری عملی تصویر یوں ہے۔

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے

کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

عملی طور پر یہ نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ ''جبیں سے افشاں چھڑانا'' ایک سین کی تکمیل ہے اور دوسری زندگی کا آغاز بھی، جو نظم میں کہیں نہیں ہے۔ مگر ''نئی نویلی کا جبیں سے افشاں چھڑانا'' اپنے Inative Responses Image سے خیال پیش کرتا ہے۔ تاہم امیج مکمل ہے اور اس کی لچک اور پھیلاؤ Elasticity یہیں پر ختم بھی ہو جاتے ہیں:

نظم کا آخری شعر بہت واضح نہیں ہے اور نہ اس کا جوڑ پوری نظم میں فٹ بیٹھتا ہے۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب آسان نہیں۔ شعر یوں ہے:

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو ذرا ٹھہرنا

ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آرہی ہے؟

اس شعر کو نظم کی مکمل تصویر سے الگ کر کے، کوئی چاہے تو، شاعر کی طرف سے، اس نظم کا عنوان دریافت کرنا بھی کہہ سکتا ہے۔ یا پھر عروس نو کی آہستہ خرامی یا ''ہوائے سیر گل'' جو چاہیں، اس شعر کے جواب میں، تلاش کر لیں۔ لیکن اگر ایسا ہے، تو پھر یہ شعر اس بڑی تصویر کا دوسرا رخ (Phase) ہوگا جس کا اصل نظم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تصوراتی فیصلہ (Meditati onal judgement) بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس سے شاعر نے ''ملکۂ بہار'' کی آمد کا تصور پیدا کیا ہو اور پھر بہت گھما پھرا کر ''نئے دور کی آمد'' شاعر کو متصوّر ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسے Low key کی کیفیت میں دیکھیں تو اس آخری شعر کو صرف جوشؔ کے رومانی مزاج کی ایک لہر کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسی تعبیرات کے لئے ہر وقت موڈ اور Attitude کو نظر میں رکھنا ہوگا۔

نظم کا خارجی دائروی (Peripheral) مطالعہ ختم ہوا۔ اب نظم کی زبان کا بھی مطالعہ ضروری ہے کہ زبان ہی خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ جوشؔ کی نظموں میں مجموعی طور پر الفاظ کا ذخیرہ (Stock) فیوڈل سوشل آرڈر سے آتا ہے۔ وہ صورت یہاں بھی موجود ہے۔ اس نظم کے تقریبا تمام الفاظ میں فیوڈل تجربے، استعمال اور الفاظ کا وہی برتاؤ (Behaviour) موجود ہے۔ الفاظ اور ان کی مختلف الجہتی، ایک مطمئن، خوش باش اور کسی حد تک رومانی مزاج رکھنے والی سوسائٹی کے تجربے اور دلچسپیوں سے آئے ہیں اور شاید انھیں کے لئے پیش بھی کئے گئے ہیں۔ کم از کم اس نظم کے

استعمال شدہ الفاظ میں تخلیقی اظہاریت (Creative Responsies) بہت کم ہے۔ جوش کا مخاطب فیوڈل طبقہ ہے اور اسی طبقہ کو شاعر نے ذریعہء اعتبار بھی بنایا ہے۔ ہر دور کی شاعری میں کون کس سے مخاطب ہے؟'' کا سوال اٹھنا چاہئے کہ اسی سے شاعری کی پرتیں کھلتی ہیں اور شاعری کا حلقہ اثر بھی متعین ہوتا ہے۔ اس نظم میں فیوڈل تجربوں اور Catch words ۔کو ذرا ان الفاظ اور ترکیبوں میں تلاش کیجئے۔

(۱) ''جبیں سے زلفیں ہٹانا'' (عمل سے ہٹ کر، الفاظ کی روانی سے محسوسات کی سطح تک)

(۲) نغمۂ طرب ''جشن رنگ و بو''۔ کلی کلی گنگنا رہی ہے (آسودہ حالوں کا، ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تصور کرنا یا ''جشن رنگ و بو'' اور نغمۂ طرب میں شامل ہو کر ان کیفیات کا تجربہ کرنا) اگرچہ یہ تجربے عملی طور پر Capitalist Society میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر الفاظ سے محسوسات تک پہنچنے میں اس نظم میں فیوڈل تجربہ ہی شامل ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں سوچنے کا یہ طریقہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سوسائٹی ان الفاظ کی جمالیاتی تہوں تک، اس رکھ رکھاؤ کے ساتھ نہیں پہنچ سکتی جس رکھ رکھاؤ اور تحریم کے ساتھ جوش کی فیوڈل سوسائٹی پہنچتی تھی۔ نظم میں کوئی Episode نہیں۔ ہاں الفاظ کی اشاریت جو غزل کے ماحول نے شاعر کو سکھائی ہے، اس سے Episode بن سکتا ہے۔ واقعہ (Event) بھی کوئی نہیں مگر الفاظ میں ایسی تہیں ہیں کہ واقعہ بن لیتی ہیں جیسا کہ مقالے کی ابتدا میں پیش کیا گیا۔

(۳) ''رسیلی جھپکی آنکھ'': ''نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے۔'' ''ہیرے کی کیل پہنے پری کا مسکرانا'' سب میں الفاظ، اشاریت ہے۔ واقعہ (Event) بنا سکتے ہیں مگر Episode کے لئے اس نظم کا کینوس کافی نہیں ہے۔ اب ذرا ان تجربوں کو اپنے چشم تخیل سے دیکھیئے۔ کیا کیا واقعے بن سکتے ہیں اور ان میں کیسے کیسے بیانات (Narration) کے امکانات ہیں۔ پھر ''موتی'' ''ہیرے''۔ سبک پنکھڑی''، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے۔'' ان تمام الفاظ میں سوشل آرڈر (Social Order) کی سطح صاف ابھر آتی ہے اور تجربہ بھی۔ کچھ الفاظ Supernumery یعنی حشو و زوائد بھی ہیں۔ جوش کی شاعری اصلاً اطناب کی شاعری ہے اور اس لئے ان کی تمام تخلیقات میں

Supernumery الفاظ موجود ہیں بلکہ الفاظ کا ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ اگر اسے لفاظی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو یہ بھی فیوڈل سوشل آرڈر سے آتے ہیں کہ علم صحبت جو فیوڈل سوشل آرڈر کا محبوب طریق کار رہا ہے، اس میں افسانہ طرازی، بغیر الفاظ کے زیادہ صرف (بہ معنی خرچ) اور تھوڑے بہت اپج سوڈ کے ممکن نہیں۔ جوش کے یہاں انقلابی نظموں یا کچھ فلسفیانہ رباعیوں میں الفاظ جو Density لے کر آتے ہیں اس نظم کے کسی لفظ میں ویسی Density نہیں، اور اسی لئے اس نظم کے الفاظ میں، وزنی پرتیں بھی نہیں ہیں، جس طرح کی وزنی پرتیں، ان کی دوسری نظموں کے الفاظ میں، ہوا کرتی ہیں۔ اسی لئے اس نظم کا ماحول، ہلکا پھلکا رومانی ماحول بن جاتا ہے، جس میں شاعری کی آواز محفلوں کیا صرف نجی نشستوں کے سامعین سے آگے نہیں جاتی اور اس فضا میں زیادہ لوگوں سے شرکت کی تمنا بھی نہیں جب کہ انقلابی نظموں کی گلاسری اور الفاظ کی دھمک زیادہ لوگوں کو لپیٹ لینے کی خواہش مند ہے، جن میں اکسانے کی کیفیت ہے۔ اسی وجہ سے یہ الفاظ اجیٹیشنل (Agitational) ہوتے ہیں جب کہ البیلی صبح میں ایک طرح کی نرمی ہے۔

البیلی صبح کا لہجہ (Tone) بہت نرم ہے۔ نظم میں لہجے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ امریکی ناقد کلینتھ بروک نے اپنی کتاب Understanding Poetry میں بڑی دل چسپ بات کہی ہے کہ "کسی نظم میں، اس کا لہجہ، شاعر کا اپنے موضوع، اپنے سامعین اور خود اپنی طرف، اس کے رویئے کا اظہار کرتا ہے۔" یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ شاعر جو پیش کر رہا ہے وہ کس طرح کے سامعین کے لئے ہے اور کیا وہ خود، اس میں شریک ہے؟ کیونکہ کبھی کبھی نظم کا لہجہ جب منفی یا طنزیہ ہوتا ہے تو شاعر، اس کے ساتھ نہیں ہوتا اور سامع کا امتحان بھی لیتا ہے کہ سامع مہالکشمی کے پل کے کس طرف ہے۔ لیکن جب وہ شریک ہوتا ہے تو لہجے کی ایجابیت، اس کے رجحان اور دل چسپی کا مظہر بن جاتی ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ سامع بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ میرا خیال ہے کہ البیلی صبح کا لہجہ کچھ اسی طرح کا ہے۔ بہت نرم، ایجابی محسوسات سے مملو اور انقلابی لہجے کے برخلاف قاری یا سامع کی شمولیت کا جزوی متمنی۔ الفاظ کا انداز نشیبی انداز کا ہے۔ ان میں Tensional Echo نہیں اور نہ رزمیہ ہی ہے۔ ایک بہاؤ ہے جو آہستہ خرامی کے ساتھ نظم کے آخری شعر تک چلا جاتا ہے۔ ان کی تمام آوازوں کا گراف بھی افقی بنتا ہے عمودی نہیں۔ انکی سطح Lowlying ہے۔ اس طرح اپنے موضوع

کے لحاظ سے، اس نظم کا لہجہ بہت ہی گوارا لہجہ بن جاتا ہے اونظم جس موڈ میں پیش کی گئی ہے، جن Audience کے لئے پیش کی گئی ہے، اپنی محدود اور Periodical Glossary کے ساتھ، اپنا تکملہ انھیں حدود میں پیش کر دیتی ہے۔

بس آخری بات نظم کی بناوٹ (Texture) کی ہے۔اس کے افعال اور اس کے جملوں کی ساخت، اس کے ضائع بدائع کا نظام اور اس کے بیانات اور دلائل (Argument Texture) کیسے ہیں۔ شاعر کی مشکلات دو طرح کی ایسے موقعے پر پیدا ہوتی ہیں۔ کیا وہ محض روایت کا اسیر رہنا چاہتا ہے اور اپنی تخلیق صرف روایت پرستوں کے لئے پیش کرتا ہے؟ کیا وہ انھیں شعری بنیادی روایتوں کو ساتھ لیکر بھی ان میں نیا موڈ، نیا مسالہ اور اظہار کا نیا طریقہ پیدا کرنا چاہتا ہے یا اپنی تخلیق کو بالکل سے غیر روایتی (Unconventional) بنانے کے حق میں ہے؟ نظم کی ساری بناوٹ ان اہم سوالوں کے درمیان سے آتی ہے۔ جوشؔ پہلے دو سوالوں کے شاعر ہیں۔وہ روایت پرست اس حد تک ہیں کہ جملوں کی بناوٹ، محاوروں کا ایک خاص صرف الفاظ کے وہ متعین معانی، جو ان کے دور اور سماج میں مروّج ہیں، یہاں تک کہ الفاظ کے اعراب و اصوات میں بھی کسی طرح کی تبدیلی پسند نہیں کرتے کہ ان باتوں کو وہ تہذیبی روایت اور ''کڑھے ہوئے مزاج'' کی دین سمجھتے ہیں۔اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ اپنی نظموں میں سارا نظام وہ اسی طرح لاتے ہیں جو روایتی صنائع بدائع، بیانات اور دلائل کے پیش کرنے کا نظام ہے۔مگر اپنی انفرادیت وہ اسی روایتی بنیادوں شعری موڈ اور بناوٹ سے کئی باتوں میں الگ کر لیتے ہیں۔انھیں حسب ذیل صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے:

(۱) نیا اور عصری مسالہ اور اظہار کا نیا طریقہ، اطناب کے ساتھ معہ روایتی شعری موڈ اور بناوٹ کے۔

(۲) افعال، جملوں کی ساخت، بیانیہ اور ایک خاص تاثر دینے کا طریقہ اور اسی طرح کے اثر کی تمنا۔

(۳) متوازن بحریں، اوزان اور صنائع بدائع کا روایتی بنیادی شعری طریقہ۔

اب ذرا البیلی صبح کو جوشؔ کے اس رویّے سے جانچا جائے۔اس نظم میں نہ تو نیا مسالہ ہے

اور نہ عصری آگہی۔ سب کچھ روایتی ہے۔ صبح کا بیان جوشؔ سے پہلے بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں جوشؔ سے بہت بہتر۔ مثلاً میر انیسؔ کی پیش کی ہوئی صبحیں چکبستؔ کی نظم ''جلوۂ صبح''۔ ان کے بہت سے مرقعے جوشؔ سے بہتر ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ البیلی صبح میں انیس کی صبحوں کی بازگشت ملتی ہے اور کہیں کہیں تو ان کے ایجاز اور اشاریت کا اطناب ہے۔ ''وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور'' والا میر انیسؔ کا بند پڑھیئے اور دیکھ لیجئے۔ جوشؔ کی اس نظم میں روایتی بنیادی شعری موڈ غالب ہے اور نظم کی بناوٹ بھی روایتی ہے۔ ''سحر کا تارا ہے زلزلے میں'' اور ''افق کی لو تھر تھرا رہی ہے۔'' روایتی مشاہدہ (Receptivity)۔ ''زلزلے'' پہلے اور ''تھر تھرانا'' بعد میں۔ ''روش''،''چمن''،''رنگ و بو''، ''طیور''، ''شاخیں''، ''کلی'' سارے الفاظ کے مجموعے (Cluster of words) تناسبات کے ساتھ ہیں۔ اور یہ تناسبات آخر تک چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس نظم میں جو افعال استعمال ہوئے ہیں، اپنا بیانیہ اچھی طرح پیش کرتے ہیں جس سے کیفیت کو اپنا اثر پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جوشؔ کے طرز بیان میں جو اضافتوں کا تواتر ہوتا ہے اور جس سے افعال اپنی نثری روانی اور کیفیت کھو دیتے ہیں، اس نظم میں نہیں ہے۔ نظم میں شاعر جو تاثر دینا چاہتا ہے یعنی، رنگ و بو، کا تاثر وہ خاصا ابھر آتا ہے۔

(۳) بحر متوازن زیادہ ہے۔ 'فعول و فعلن'، کے ٹکڑے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد بھی کرتے ہیں اور بہاؤ کو نشیبی بناتے ہیں۔ اگر شاعر کے ذہن کے پس منظر میں ''ملکۂ بہار'' کی آمد آمد ہے تو یہ بحر، قدم اندازی کا لطف بھی پیدا کرتی ہے اور اس تصور کے لئے بہت مناسب صنائع لفظی اور معنوی دونوں کا صرف ہوا ہے مگر سب سے زیادہ استعمال رعایتوں کا ہے۔ لفظی بھی اور معنی بھی۔ غیر مرئی تشبیہات کم ہیں۔ کیونکہ روایتی طرز شاعری میں غیر مرئی تشبیہات کا استعمال شاذونادر ہی ہوتا تھا کہ یہ طرز، انگریزی شاعری کے اثر سے اردو میں بطور خاص آیا ہے۔ ایک بات اور کہ اس نظم میں جوشؔ نے اطناب کی اپنی محبوب کوشش نہیں کی ورنہ یہ نظم بھی جسامت اور تطویل میں ''کسان'' بن سکتی تھی۔ نظم کے دلائل اور بیانات (Argument Structure) اشاری ہیں اور سامعین کی تسلیم شدہ ایجابیت کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

جوش کی شخصیت و شاعری پر مشتمل گفتگو
(کیلگری، کناڈا)

تحریر: عبدالندیم

شریکِ گفتگو:

قمر رئیس، اقبال حیدر، عباس زیدی، شائستہ رضوی، ناہید کاظمی،
عرفان حیدر، علی احمد فاطمی

علی احمد فاطمی :۔ ہم سب اہلِ قلم اور اہل نظر یہاں بیٹھے ہیں۔ہم جوش سے اپنے رشتوں پر تبادلہٗ خیال کریں گے۔ہم سب جوش کو پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں جوش فہم ہیں جوش شناس ہیں لیکن بہر حال ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارا فوکس آپسی گفتگو کا جوش پر ہی کیوں ہو اور بھی ہمارے شعراٗ ہیں جن کی قدر و قیمت آج اتنی نہیں ہے جتنی کل کی تاریخ میں تھی تو ہمارے عہد میں ہمارے حال میں اور ہمارے عہد کے تناظر میں ہمارے مسائل کی روشنی میں جوش ہمارے لئے کتنے اہم ہیں اور کتنے افادی ہیں اور کتنے مقصدی ہیں ۔ یہ ایک بڑا بنیادی سوال ہے اسی سوال اور اسی خیال کے اردگرد ہم اپنی گفتگو کو جاری رکھیں گے۔ہمیں بے حد خوشی ہے کے اس گفتگو میں مایۂ ناز ترقی پسند ادیب اور ناقد پروفیسر قمر رئیس صاحب شریک ہو رہے ہیں جنھوں نے پچھلے دنوں جوش کے

بارے میں کافی سوچا ہے اور کام بھی کیا ہے اس کے علاوہ اقبال حیدر صاحب جو بہت اچھے شاعر اور دانشور ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا جوش کا مطالعہ ہے اور وہ جوش لٹریری سوسائیٹی کے صدر بھی ہیں وہ اس گفتگو میں شریک ہورہے ہیں۔ جناب عباس زیدی صاحب جو پروفیشنل ادیب و ناقد تو نہیں ہیں لیکن دانشور ہیں، شاعر ہیں اور ادب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ادب پڑھتے ہیں اور جوش کو بالخصوص بہت قریب سے سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی گفتگو ایک نئے زاویہ سے آج ہمارے سامنے آئے گی میں علی احمد فاطمی حاضر ہوں اس گفتگو میں شریک ہوں اپنی چند باتیں رکھوں گا۔مزید خوشی یہ ہے کہ آج اس گفتگو میں اس بزم میں دو خواتین بھی شامل ہیں شائستہ رضوی صاحبہ اور ناہید کاظمی صاحبہ۔ یہ دونوں بھی ادب کا گہرا اور ستھرا ذوق رکھتی ہیں اور جوش کے تعلق سے بھی ان کا مطالعہ بہت صاف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جتنے بھی شریک بزم ہیں یا شریکِ گفتگو ہیں وہ جوش سے متعلق گفتگو کریں گے اور اچھی گفتگو کریں گے۔تھوڑا سا روایت سے ہٹ کر کچھ نئی گفتگو یا نیا زاویہ جوش کے تعلق سے ہمارے سامنے آئے گا تو میرے خیال میں ادب کا بھی اور موضوع کا بھی کچھ حق ادا ہوگا۔ہم گفتگو کا آغاز اپنے بزرگ اور ترقی پسند ادیب اور دانشور جناب قمر رئیس صاحب سے کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب ہمارا پہلا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم اس وقت اس گفتگو میں جوش کو کیوں یاد کریں؟ کیوں نہ کسی دوسرے شاعر کو یاد کریں۔جوش کی آج کیا اہمیت اور معنویت ہے کسی بھی بڑے شاعر و ادیب اور دانشور کو یاد کرتے وقت بہر حال ہمارا عہد ہمارا زمانہ ہماری تہذیب ہمارے مسائل سے اس کے کیا رشتے ہیں اور کیسے ہیں جوش ان میں کہاں ٹھہرتے ہیں اور کس طریقے سے آپ ان کو لیتے ہیں ؟

قمر رئیس:۔ فاطمی صاحب آپ نے جو سوال اٹھایا ہے آپ نے کہا کہ بھئی آپ نے جوش کا مطالعہ کیا ہے آپ نے اُن پر کام کیا ہے تو میں صاف عرض کروں کہ ابھی تک میں نے جوش کا کوئی بہت بالا سیتاب مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن اب شائد اس کا آغاز ہورہا ہے۔جوش Society اس کے سربراہ اقبال حیدر صاحب نے مجھے پندرہ بیس سال میں Inspire تو ضرور کیا ہے جوش کو پڑھنے کے لئے اور میں نے جوش پر کئی مضامین بھی لکھے لیکن میں سمجھتا ہوں بہت ہی ابتدائی کام ہے اور میرا مطالعہ بھی بہت گہرا نہیں ہوسکا ہے ان سب باتوں کا میں شروع ہی میں اعتراف کرنا چاہتا تھا۔اب آپ

نے جو سوال اٹھایا ہے اس کو دراصل ایسا لگ رہا ہے کہ ہم مان کر چل رہے ہیں کہ جوش ملیح آبادی کی ہند اور پاکستان میں مقبولیت ان کی معنویت ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے کم رہی ہے یا کم کی گئی ہے۔ان کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ان سے بے نیازی برتی گئی ہے۔ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے ایسا ہم لوگوں۔نے محسوس ضرور کیا ہے۔دوسرے لوگ بھی محسوس کر رہے ہیں لیکن یہاں دو تین باتیں ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ایک بڑا شاعر کلاسیکی شاعر بھی کسی ایک عہد میں ابھر کر اوپر آجاتا ہے اس کی مقبولیت اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔دوسرے شاعر ڈوب جاتے ہیں پھر اگلا دور آتا ہے دوسرے شاعر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں تو اس شاعر کی مقبولیت دبنے لگتی ہے مثلاً غالب اپنے زمانے میں مقبول نہیں رہے ایک محدود حلقے سے زیادہ ان کی مقبولیت نہیں رہی لیکن اس کے بعد ان کی مقبولیت کا سورج طلوع ہوا۔خاص طور سے انیسویں صدی کے بالکل آخر میں غالبؔ بھی مقبول ہونے لگے ہم جانتے ہیں کہ فطری اعتبار سے وہ اپنے وقت سے کچھ پہلے پیدا ہو گئے تھے اور اس کا اعتراف سب نے بعد میں کیا ہے۔حالی نے کیا دوسرے بڑے سوانح نگاروں نے کیا اور یہ وہ دور تھا جو مرزا غالب کی فکری عظمت اور اہمیت سے ہم آہنگ نہیں تھا........اور جب وہ دور آیا جب انکے فکر وشعور کی بڑائی کا احساس لوگوں کو ہوا۔سر سید اور دوسرے لوگوں کے اثر سے بیسویں صدی میں غالب کی تلاش شروع ہوئی اور پھر پورے غالب کو دریافت کر لیا گیا اس طرح ہم دیکھتے کہ ہیں آزادی کی تحریک کے زمانے میں تو جوش جیسے تخلیق کار پیدا ہوئے۔اقبال جیسے عظیم فنکار پیدا ہوئے اور ان کی عظمت کا سورج جو تھا نصف النہار پر پہنچ گیا۔دونوں کی شناخت الگ الگ تھی۔اقبال کی الگ تھی جوش کی الگ، یہ الگ مسئلہ ہے۔ہم اس پر بھی گفتگو کر سکتے ہیں اور شاید کریں آخرِ میں، ہر شاعر کی اپنی ایک الگ پہچان ہوتی ہے.......جوش کی جڑیں دوسری ہیں لیکن دونوں کی اپنی پہچان ہے دونوں کی عظمت کے اپنے آثار ہیں ہم مانتے ہیں اور جب دونوں شاعر مقبول ہوتے گئے لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو دور آتا ہے اس میں معلوم ہوا کہ جوش کی عظمت ماند پڑ گئی اور میر تقی میر جو تھے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آ گئے۔اس کے تاریخی اسباب تھے ہجرت کے بعد جوش کی مقبولیت اور اہمیت اور عظمت کے جو بھی آثار تھے وہ ماند پڑتے گئے۔پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی باوجود اس کے ان کی آپ بیتی آئی ان کے مجموعے بھی شائع ہوئے اور ان کا ایک حلقۂ پسندیدگی بھی

رہا۔ پاکستان میں بھی رہا ہندوستان میں بھی وہ جدید شاعر بھی تھے اور نو کلاسیکی بھی لیکن کلاسیکی شعراؑ کے صنف میں ہم انھیں ایک بلند مقام دیتے ہیں جیسے اقبال تھے حسرت موہانی تھے اور چند شاعر تھے ان کو ہم کلاسیکی شاعر مانتے ہیں اور کلاسیکی اور نو کلاسیکی شاعر کی عظمت کے جو پیرامیٹرس ہوتے ہیں وہ بہت کچھ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں اس میں ایک طرح کی آفاقیت اور عظمت ہوتی ہے۔ باوجود اس کے وہ اپنے عہد سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے عہد کو پوری طرح متاثر کرتے ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ بنی رہتی ہیں وہ جوش کے یہاں پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں لیکن وقت کے چنگل میں وہ جس طرح سے تھے ویسے ہر شاعر نہیں ہوتا ہے اس میں ہوا یہ کہ اس وقت کی جو ضرورت تھی۔ جو مطالبے تھے مثلاً آزادی کی تحریک مثلاً نشاۃ الثانیہ کا ایک دم سے ابھار اور قدامت پرستی اور ظلمت پرستی اور توہم پرستی کے خلاف ایک نوجوان طبقہ اُبھر کر آ گیا تھا اور جوش اس کے سربراہ تھے۔ مثلاً ترقی پسندی جس میں مزدور اور کسان کی اہمیت کو بتایا اور جتایا اور اسے لکھ کر جوش بھی اس کے قریب تھے اور ترقی پسند شعراؑ کی طرح جیسے اقبال کی شاعری میں ہم دیکھتے ہیں اسلامی فکر اور اسلام کا اتحاد اور اسلام کا احیاء بڑی معنویت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے دور میں بے حد مقبول ہوئے۔ لیکن بعد میں وہ عناصر چھٹ گئے اور ان کی عظمت کے دوسرے اوصاف تلاش کئے گئے اس طرح جوش کے ساتھ بھی ہوا۔ میں یہ ضرور مانتا ہوں اور یہ مان کر ہمیں چلنا چاہئے کہ پچھلے تیس چالیس سال میں اگر جوش کی مقبولیت اور ان کا مطالعہ، ان کی معنویت کا احساس کم ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جوش کی عظمت پر کوئی حرف آیا ہے بالکل نہیں .....جوش کی عظمت کے جو بھی اوصاف وعناصر تھے وہ اپنی جگہ ہیں اس لئے کہ بڑی شاعری کلاسیکی شاعری کے جو پیرامیٹرس ہوتے ہیں اُس پر جوش کی شاعری کا بڑا حصہ پورا اترتا ہے جس طرح اقبال کی شاعری پر اترتا ہے۔ غالب کی شاعری پر اترتا ہے۔ اس لئے جب ہم کوئی نئی بات تلاش کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جوش کی شاعری کے وہ کون سے ایسے اوصاف وعناصر تھے جن کی وجہ سے آزادی کے بعد ان کی مقبولیت میں کمی آئی اور وہ کون سے اوصاف تھے جن پر زور دیا جاتا تھا۔ ہماری دانشگاہوں میں ہمارے اداروں میں ہمارے نقادوں اور دانشوروں کی سطح انکی شاعری پر زور نہیں دیا گیا۔ اس میں ہم ضرور قصور وار ٹھہرتے ہیں تو اس طرح سے میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم جوش کی تلاش نو کی طرف بڑھ

رہے ہیں جوش کی مقبولیت کو اَز سرِ نو تلاش کر رہے ہیں اور تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس میں ہمیں ان تمام اسباب کو ذہن میں رکھنا ہوگا اور میرے خیال میں اس وقت ضرورت اس کی ہے جوش کی عظمت اپنی جگہ ہے لیکن جوش کو Re-establish کرنے کے لئے بِرصغیر ہندو پاکستان کے ادبی حلقوں میں ضرورت اس کی ہے کہ ایک Discourse قائم کیا جائے۔ جوش پر اگر ہم محسوس کر رہے ہیں کہ جوش کو ساتھ لے کر چلنا ہے ان کی تمام عظمتوں اور پستیوں کے ساتھ تو یقیناً میں چاہوں گا کہ ہندوستان پاکستان کے حلقوں میں دانشگاہوں میں دوسرے اداروں میں دوسرے اداروں کے وسیلے سے ہم جوش کی شاعری ان کی عظمت ہی نہیں کمیوں اور کوتاہیوں کو بھی لے کر ہم ایک Discourse قائم کریں۔ معروضی طور پر عملی طور پر تنقیدی طور پر بھی ہم شاید کسی نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔

علی احمد فاطمی:۔ اقبال حیدر صاحب ابھی ڈاکٹر صاحب نے یہ فرمایا کہ پچھلے پچیس تیس برسوں میں یا دو تین دہائیوں میں جوش کی معنویت یا اہمیت کچھ ہلکی سی ماند پڑ گئی تھی اور ماند ہو جانے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب جوش کی عظمت کے قائل ہیں۔ عظیم شاعروں کے ساتھ کبھی کبھی ایسا واقعہ آتا ہے حالانکہ میں اپنے طور سے سمجھتا ہوں کہ واقعی کوئی شاعر عظیم ہے تو اسکے جو عظمت کے اقدار و افکار ہیں وہ ہر دور میں کسی نہ کسی طرح سے Reflect کرتے ہیں اور اس کو ماند نہیں پڑنا چاہئے تو ایک تو یہ کہ ماند پڑنے والی بات ہے اس سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کی ان کو Re-establish کرنے کی ضرورت ہے تو Re-establish کا جو عمل ہے یہ خود اپنے آپ میں جوش کے سامنے سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔ آپ اس کی ضرورت اور اہمیت کو کس طرح لیتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں آج کے تناظر میں....؟

اقبال حیدر:۔ شکریہ فاطمی صاحب ! دیکھئے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سن کر ابھی جس چیز کو میں سوچ رہا تھا کہ مجھے جب گفتگو کرنے کا موقع ملے گا تو جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں جوش کو میں اس تہذیبی تناظر کے Part کے طور پر دیکھتا ہوں جوش جو ہمارے نزدیک ایک بڑے تہذیبی منظر نامے کا ایک Part ہیں جسکی وجہ سے ہم نے انھیں یاد کیا یا فراموش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کی طرف آتے ہوئے اس کے پہلے شاید ہم نے ایک دو مرتبہ عرض کیا ہے کہ جو یہ سلسلہ ہے ہمارے

نزدیک ایک بڑا شاعر اپنے زمانے میں اتنا مقبول نہیں ہوتا جتنا کہ بعد میں ہوتا ہے بڑا فطری سا ہے کیونکہ ذہن سازی کا عمل جو شاعر کرتا ہے مفکر، فلسفی، یا ادیب اپنے زمانے میں وہ ذہن نہیں ہوتے جس کے ساتھ پیدا ہوتے اور چل رہے ہوتے ہیں۔ وہ ذہن ہوتے ہیں جو آرہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح حالی اور غالب بہت واضح ہیں۔ جب حالی آئے تو حالی غالب کی فکر کے پروردہ تھے تو غالب کی معرفت ان کے پاس بدرجہ بہتر تھی حالی نے ان کو دریافت کیا یا نو دریافت کیا اور حالی اور غالب دونوں کو جائز مقام ملا اور وہی کل ملا کر جوش کے ساتھ ہے اب جوش کے ساتھ ماند پڑنے والا معاملہ جو میرے خیال سے ہوا یہ کہ جوش تاریخ کے ایک بہت اہم موڑ پر آئے جہاں تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں............لیکن بہر حال وہ سرحد پر بڑھتی رہتی ہیں۔ آگے ہمارے یہاں جو جغرافیائی عمل ہوا اس کی وجہ سے تہذیب بدل گئی۔ ہر چیز اُلٹ پلٹ سی گئی۔ جوش اور فراق کی طبیعت کے زیرِ اثر اس کی جگہ مذہبی عناصر کو موقع مل گیا۔ ظاہر ہے وہ ذہنی سفر جو تھا وہ ایک دم سے مُڑ گیا یا منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد جو شاعری تخلیق ہوتی ہے میرے خیال سے دس سال لگا ہے .... یہ Realise کرنے میں تھوڑی بہت Changes آ گئی ہے اور قبولیت جو فکر کو ملنی ہے وہ اب نہیں رہ گئی۔ کم از کم پاکستان میں اور پھر اس میں متزاد یہ کہ جوش ہندوستان چھوڑ کر چلے آئے تو ہندوستان میں ایک مسئلہ وہ کھڑا ہو گیا اس سے پورے اردو کلچر کو نقصان پہنچا ہے صرف جوش کو نہیں۔ اب ماند پڑنا اس لئے شروع ہو گئے کہ لوگوں نے کہا کہ ہم اپنے آپ کو ایسا Adjust کریں کہ خاص طور سے اسلوب میں جو Change آیا ہے وہ وہاں سے آیا ان کے نزدیک بہت ہم اہم ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ اسلوب میں Change آ گیا ہے کہ اب اسلوب اس طرح سے نہیں ہوتا کہ اب جو بات چل رہی تھی وہ اس طرح سے چل رہی تھی کہ جیسے باتوں کو کہنے کی تشفی خود بھی آدمی حاصل کر لے۔ ان کے یہاں بھی کی۔ ہاں بھئی ہم نے تو اپنی بات کہہ لی لیکن اتنا ڈھک چھپ کے کہے اسکو کہ ایسا لگے کہ Receive کرنے والے تک وہ بات پہنچی ہی نہیں یہ بہت بڑا خلل اس اردو ادب میں آیا جو ابھی تک جاری و ساری ہے۔ آپ کے ساتھ میں جو خاص طور سے بات ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی عرض کر چکا ہوں کئی دفعہ ہر ادب اپنی تہذیب اور فکری عمل کا ایک Part ہوتا ہے ہمارے یہاں جو اسلوب ہے وہ فطری نہیں رہ گیا۔ اس کی کہیں نہ کہیں کمی یا کوتاہی آئے گی۔ اسی کا شکار جوش

بھی ہوئے جوش جوشکار ہوئے تو اصل میں جوش کی سب سے بڑی شخصیت اصل میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ جوسب سے بڑا Stumbling Block جسے انگریزی میں کہیں وہ جوش کی اپنی شخصیت تھی کہ جوش جو تھے اتنے Complex تھے Genious جو بھی ہوتا ہے وہ اتنا Simple آدمی نہیں ہوتا کہ آپ اسکے ساتھ بیٹھ کر X.Y.Z کی طرح بتادیں کہ اسکا کس Type کا Nature ہے۔اس کے Nature کے اتنے مختلف Type کے رنگ ہوتے ہیں کہ وہ ہر طرح اسی Situation کو مختلف دور میں اتارتا ہے۔اس کا دوسرا جواز یا Respoice(??) ہو جوش کے یہاں بھی یہی ہے فراق کے یہاں بھی یہی ہے۔غالب کے یہاں بھی ملے گا آپ کو۔یہ اقبال کے یہاں بھی ہے کسی حد تک لیکن اقبال اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے اقبال کو پورا ایک خطہ Delcuer(??) کرنا تھا۔خاص اسلامی سماج کو لے کر تو وہ بے چارے مجبور بھی ہو جاتے تھے لیکن یہ انکی قربانی ہے اسکے ساتھ ساتھ اب جوش کے اوپر جب یہ رنگ آپڑا کہ جوش صاحب اب غیر مقبول ہوتے گئے تو ان کے یہاں ایک طرح کی شکستگی یا پسپائی آپ دیکھ سکتے ہیں۔اس کے بعد وہ زیادہ ہاتھ پاؤں مارنا شروع کرتے ہیں۔بحیثیت مفکر، بحیثیت Thinker مجھے کہنا چاہئے..........تو انھوں نے سوچا کہ میں کیا کروں کہ لوگوں کو پتہ چلے تو کہیں کہیں تو جوش کے یہاں غم وغصہ بہت زیادہ آجاتا ہے، ہم اور ڈاکٹر صاحب اس دن گفتگو کر رہے تھے جوش کا جو لہجہ ہے وہ سوٹ نہیں کرتا وہ اس سے کہ وہ جس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں تو یہ سب عوامل ہیں جوش کے یہاں۔جوش کے یہاں ایک خاص قسم کا پرووژن پایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جو چیز جوش کے یہاں ہے وہ اسکا اعتراف کرتے ہیں لیکن اسکو چھپاتے نہیں۔میں آج تک کے ادب میں دیکھ رہا ہوں اور فاطمی صاحب کل رات بھی یہی گفتگو کر رہے تھے کہ وہ پرووژن بہ تدریج بڑھ رہا ہے اور اس کا اظہار اور اقرار مختلف ہے۔اظہار اور اقرار آپ وہ کر رہے ہیں جو آپ چاہتے ہیں دنیا سے اپنے ادب میں اپنی نظم میں اپنی نثر میں لیکن عورت ابھی تک صارفیت کا شکار ہے مردوں میں، اور یہ سب چیزیں جو ہیں انکو Discuss کرنا چاہیئے کہ اس وجہ سے جوش کیوں مختلف ہیں۔میرے نزدیک جوش اس لئے مختلف ہیں کہ Perversion تو ویسے ہی رہا لیکن جوش نے اسکو اقرار کیا انکار کیا تفاخر کی طرح سب کچھ تھا لیکن جوش نے اسکو یہ نہیں کیا کہ مغرب نے جو ہمیں فلسفہ بتایا کہ عورت کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرو برابری سے ہم کہیں گے تو یہی لیکن ہم کریں گے تو

وہی جو ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں جو عورت کی طرف رویہ ہے ہمارا جو سماج کی طرف روّیہ ہے جو مذہب کی طرف رویہ ہے،ہم لوگوں کی ایک مشکل ہے کہ مذہب کو لے کر ہم لوگ گفتگو کر ہی نہیں سکتے ۔کہیں پر کھڑے ہو کر چار پانچ آدمی جتنا مجمع بڑھتا چلا جائے گا اتنی ہماری مصیبت بڑھتی چلی جائے گی ۔کوئی ہو تو جا کے امام باڑے میں مسجد میں بُلایا جائے وہ وہاں جا کے وہی بات کرے جو جوش کرتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہو پاتا۔

علی احمد فاطمی :۔اقبال صاحب آپ کی گفتگو میں ایک Perversion کا لفظ نکل کر آیا۔خاص طور سے عورت سے متعلق لگا یہ کہ یہاں دو عورتیں موجود ہیں تو کیوں نہ اس موضوع پر کسی ایک خاتون سے بات چیت کی جائے۔ میں شائستہ صاحبہ سے کہتا ہوں کہ پہلے تو وہ جوش کو قاری کی حیثیت سے اپنا ایک تاثر دیں کیونکہ وہ جوش کو کیوں پسند کرتی ہیں کیا وجہ ہے کیا محض اس لئے کہ ان کے والد جوش کو پسند کرتے تھے یا انکے بھائی جوش کو پسند کرتے ہیں یا خود ان کی اپنی بھی پسند یا ناپسند جوش سے متعلق کیا ہے اور پھر اگر اس گفتگو میں یہ بھی شامل ہو جائے کہ جوش کے یہاں تصورِ زن یعنی عورت کا تصور کیا ہے اپنی وہی Perversion والی بات اس سے آپ اتفاق کرتی ہیں کہ نہیں کرتی ہیں ؟

شائستہ صاحبہ :۔جس Point of view سے ہم جوش کو سمجھتے ہیں اور جس پر بات بھی کرتے ہیں کہ جہاں شاعری اتنی انسانیت نواز اور اتنی بلند بانگ فکری سطح پر رہتی ہے لیکن ان کے ساتھ شاعری سے زیادہ.........اگر آپ نے ان کی گفتگو سنی ہو انٹرویو وغیرہ سنا ہو تا ان کی جو رائے ہے اس بارے میں سوالات اٹھتے ہیں۔ان کے یہاں اور بھی کمزوریاں ہیں جو کہ ہر شاعر میں ہوتی ہیں لیکن ان کی ان کمزوریوں سے قطع نظر صرف اگر اوصاف کو ہی دیکھا جائے تو اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ پہلے ہمیں تو ان کے قرض اتارنے ہیں ......جو انھوں نے اردو شاعری کو دیا اور جو اپنے عہد کی تصورِ زن کو بلند کرنے کے لئے کہا بھی اور اپنے عمل سے بھی کر کے دکھایا وہ Feudal background کے آدمی تھے اور ان کے اندر جاگیرداری طنطنہ اور دبدبہ جس کے لئے وہ ہمیشہ مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں وہ رہا۔تو ہمیں اس مسئلہ پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ حالانکہ وہ اس سے زیادہ اس کی قیمت ادا کر چکے ہیں جتنی کہ کرنی چاہئے تھی لیکن جوش کی اگر ہم شاعری کی اس حصہ کی گفتگو کرنا چاہیں جس کے لئے انھوں نے اردو کا دامن بیش بہا موتیوں سے بھر دیا تو اس کے لئے ہمارے ذہن میں جو بات

اٹھتی ہے کیوں اور کیسے جو آپ لوگ اپنے مزاج Discuss کر چکے ہیں اس رسالے کے حوالے سے ہم کچھ کہنا چاہ رہے تھے کہ جو رسالہ شروع ہو اس کے اشتہار آ جائیں اور بھی رسالے میں اس کی آمد کا اعلان ہو دوسرے کچھ اکابرین ادب ہیں ان کی فہرست بنائی جائے۔ ایک گوشہ جوش کی نادر ترکیبوں اور ان کی لفظیات کا اس طرح سے تیار کیا جائے کہ آج کے قاری اسے بہ آسانی سمجھ سکیں۔ یہ ایک بڑا موضوع ہے۔ دیکھئے ان میں تضادات تو تھے وہ چاہے جتنے اشتراکی اور مزدور اور کسان کے ہمدرد ہوں لیکن ان میں کبھی عوامی شاعری والی بات نہیں آسکتی تھی۔ اس میں ان کی جو سطح ہے اور اس میں ان کے الفاظ کا جو خزانہ ہے وہ اس کے آڑے آتا ہے تو ہر شاعر کو ہم اس کی سطح پر لیتے ہیں۔ جوش فیض نہیں ہو سکتے تھے اور فیض تو کبھی بھی جوش نہیں ہو سکتے تھے۔

قمر رئیس:۔ مداخلت کے لئے معذرت لیکن شائستہ صاحبہ آپ سے جوش کی عورت کے بارے میں جو سوال کیا گیا آپ اسے ٹال گئیں۔ آپ دیکھئے کہ عورت سے متعلق جوش کا سارا رویہ فیوڈل ہے وہ اکثر صرف مرد کے تعیش کا سامان بنتی ہے۔ ایک بات اور...... ہر عہد اپنے کلاسکی ادب کو از سرِ نو تلاش کرتا ہے۔ دنیا کے ادب میں یہ عمل جاری رہا ہے۔ آپ بھی نئی نسل کی ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آج آپ کی حسیت ماقبل سے مختلف ہے۔ اپنی حسیت کے تعلق سے جوش کی شاعری کو کس طرح قبول کرتی ہیں۔

اقبال حیدر:۔ شائستہ صاحبہ آپ کو فاطمی صاحب کے پہلے سوال کا جواب بھی دینا ہے۔ یہ کہ آپ جوش سے کیوں متاثر ہیں۔ یہ مسئلہ محض سیڑھی پیڑھی کا ہے یا آپ کا اپنا بھی کچھ احساس ہے۔

شائستہ:۔ سیڑھی پیڑھی سے جو کچھ آتا ہے وہ مذہب تہذیب تک محدود رہتا ہے وہ اگر نہ کریں تو احساس جرم ہوتا ہے۔ جہاں تک شاعر اور شاعری کا تعلق ہے وہ جب تک آپ کو خود پسند نہیں آتا یا متاثر نہیں کرتا تو بات نہیں بنتی۔ جوش کی شخصیت و شاعری کے چرچے ہمارے بزرگوں اور ہمارے گھروں میں ضرور تھے لیکن جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے گئے اور شاعری کی سمجھ آتی گئی ان کے اوصاف کھلتے گئے۔ ان کے تضادات بھی جہاں تک عورت کے تصور کی بات ہے میں نے اسے ٹالا نہیں لیکن میں نے زیادہ بات اس لئے نہیں کی یا نہیں کرنی چاہی...... اس لئے کہ جو تضادات ان کے یہاں ہیں عورت کو لے کر وہ بہت واضح ہیں اور بہت Crude ہیں لیکن جوش کے جو ہمعصر

ہیں ان کا رویہ نسبتاً Refined ہے۔

ناہید:۔شاعری کی حد تک یا محض سوچنے کی حد تک...........

شائستہ:۔دونوں سطح پر......آپ ان کی گفتگو سنئے۔ کہتے ہیں کہ جوعورت تعلیم حاصل کرتی ہے تو اس کے چہرے پر جو کھردرا پن آجاتا ہے وہ انھیں اچھا نہیں لگتا۔ وہ ان کے جمالیاتی احساس پر گراں گزرتا ہے۔

فاطمی:۔بات جب کہ ان کے تصورِعورت پر آگئی ہے تو میں بھی عرض کروں آپ نے اس کو بے حد Crude رویہ کہا۔ڈاکٹر صاحب بھی اس کو فیوڈلیزم کی طرف لے گئے......ہوسکتا ہے یہ سب سچ ہو۔ میں اس سے انکار نہیں کرنا چاہتا۔ جوش نے اپنی ذاتی زندگی میں شخصی رویے میں عورت کو جس طرح سے جنس و جمال کے حوالے سے لیا ہو آپ لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے لیکن ہمارے سامنے تو اب ان کی نظمیں ہیں جن میں انھوں نے عورت کو پیش کیا ہے۔نئی نسل تو گفتگو، انٹرویو وغیرہ کو نہیں دیکھے گی وہ تو صرف انکی نظمیہ شاعری دیکھے گی۔ پڑھے گی اور سمجھے گی۔آپ ذرا غور سے ملاحظہ کریں ان نظموں کو تو مجھے لگتا ہے کہ آپ کو ان کی شاعری میں عورت کے دو روپ ملیں گے۔ پہلا روپ تو محبوب کا ہے، اس کے حسن کا بیان، اُس کے مختلف زاویے، ان کی نظم جنگل کی شہزادی پڑھئے تو کتنے زاویوں سے ذکر ملتا ہے۔

اقبال حیدر:۔معاف کیجئے گا فاطمی صاحب.....آپ کی بات کٹ رہی ہے۔ میں نے جو لفظ پروڈژن کا ذکر کیا ہے اس سے مراد........یہی ہے کہ وہ مرد کی نگاہ سے ہی عورت کو دیکھتے ہیں۔ جن میں Male Chauvinism دکھائی دیتا ہے۔عورت پر شک بھی کیا۔ اس تعلق سے جوش پر میرا اعتراض تھا اور آج بھی ہے۔

ناہید:۔شک بھی اور ننگا بھی کیا.........

اقبال حیدر:۔مگر یہ بھی ہے کہ انھیں صرف عورت کا حسن ہی نظر نہیں آرہا تھا بلکہ وہ عورت بھی نظر آرہی تھی۔ جو زمین پر پتھر کوٹ رہی ہے۔محنت کر رہی ہے۔

فاطمی:۔میں یہی عرض کرنے جا رہا ہوں کہ کیا جوش کا یہ بڑا کارنامہ نہیں ہے کہ چلمن کی آڑ سے جھانکنے والی عورت کو جنگل میں خانقاہ میں اور سڑک پر لا کھڑا کیا۔ دکن کی عورتیں مالن، بھنگن،

مزدورنی، مہترانی وغیرہ جواردو شاعری میں نہیں تھیں انھیں وہ لے کر آئے۔ نظم میں پہلی بار جوش لے کر آئے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ بعد میں اختر شیرانی آئے۔ غزل میں حسرت نے بالکل ایک ماڈی اور حقیقی معشوق کو پیش کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کو ناہید صاحبہ آگے بڑھائیں۔ اپنے خیالات رکھیں۔

ناہید:۔ دیکھئے میرا مطالعہ اس نوع کا نہیں ہے کہ میں باقاعدہ کوئی رائے قائم کروں لیکن جتنا میں سمجھتی ہوں جیسا میں سمجھتی ہوں جوش کی سب سے بڑی ایمانداری یہ تھی کہ جو اندر تھا وہی پوری ایمانداری سے باہر کردیا۔ جس کی انھیں قیمت ادا کرنی پڑی۔ تو یہ سچائی تو تھی ان میں اس لئے عورت کے بارے میں جو وہ سوچتے تھے انھوں نے براہ راست اس کا اظہار کردیا۔ کچھ چھپایا نہیں۔ اب آپ جو بھی رائے قائم کریں میں تو ان کے اس رویے کو پسند کرتی ہوں۔

فاطمی:۔ آپ شاید یہ کہنا چاہتی ہیں کہ جوش ہوں یا فراق ہوں ان سب کے یہاں ہپوکریسی نہ تھی۔ جیسا کہ عموماً ہوتی ہے اور اس چیز کو فیوڈل نظام آسانی سے ہضم نہیں کرسکتا تھا اس لئے بھی جوش معتوب ہوئے۔ اور ان پر ایک خاصہ طبقہ کا عذاب نازل ہوا۔ ہم ذرا موضوع کو پھر بدلتے ہیں اور ہمارے بیچ میں ایک سائنٹسٹ موجود ہیں میرا ان سے یہ سوال ہے کہ عباس صاحب آج دو ہزار سات میں، ہم خاص طور سے مغرب میں جس طرح کی زندگی جی رہے ہیں Technology کی Information اور سائنس کی زندگی ہم جی رہے ہیں۔ اور آپ سائنٹسٹ ہیں مجھ سے بہتر بھی سمجھ سکتے ہیں تو اس سائنسی اور ٹکنیکی ترقی اور تبدیلی کے دور میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ادب کی، شاعری کی موت ہو چکی ہے۔ حرف ولفظ جو ہیں وہ فوت ہو چکے ہیں تو ایسے میں ایک سائنٹسٹ ہونے کے ناتے آپ شاعری کو بالعموم اور جوش کی شاعری کو بالخصوص کس طرح لیتے ہیں۔ ایسے اعلانات اور ایسے نعروں اور محاوروں کے بیچ۔۔۔۔؟

عباس زیدی:۔ فاطمی صاحب یہ آپ نے بڑی اچھی بات پوچھی اور ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک بات کہی تھی کہ جو بڑے شعراء ہیں ایک دور آتا ہے کہ لوگ ان کو بہت زیادہ چاہتے ہیں پھر کوئی دوسرے شاعر اُبھر کر آجاتے ہیں یہ بڑی ہی مزے دار بات ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے، میرے خیال میں اس کی وجہ ہے کہ جیسے جیسے اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر ہمارے حالات بدلتے ہیں اسی طرح سے ہمارے

مسائل ہوتے ہیں کسی فرد کے یا کسی قوم کے اس کے حساب سے ،ہم دیکھتے ہیں کہ کہاں سے ہمیں Inspiration مل سکتا ہے اور Inspiration بھی بڑی مزے دار چیز ہے اسکا تعلق جو ہے ،بحر حال ہمارے اپنے تمدن اور اپنی تہذیب اور خاص طور سے اپنی زبان سے ہوتا ہے اور عقائد سے ہوتا ہے اسمیں مشکل یہ ہے کہ جب آپ دیکھتے ہیں اور نئے مسائل ڈھونڈنا چاہتے ہیں انکا حل تو عموماً لوگ تین طریقے استعمال کرتے ہیں یا تو وہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں یا اکثر بدعت کرتے ہیں یا اجتہاد، تخلیق تو آسان ہے اور زیادہ تر لوگ وہی کرتے ہیں چاہے مسئلہ حل ہو یا نہ ہو وہ اسکے پیچھے ڈنڈا لے کر ایسے ہی پڑے رہتے ہیں جیسے کہ ان کے اجداد نے کیا تھا۔مسائل بدل چکے ہیں حالات بدل چکے ہیں لیکن وہ اسی طرح سے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پھر مسائل حل نہیں ہو پاتے بعض لوگ کود کر آجاتے ہیں اور لفظ جو استعمال ہوگا میرے خیال وہ بدعت ہے اور بدعت میں آپ کا تجزیہ یہ نہیں ہوتا آپکی اپنی جو روایات تھیں جو اپنی تاریخ ہے آپ کا جو ورثہ ہے اس پر آپ کی پوری گرفت نہیں، ہے لیکن آپ کود کر آ گئے شہرت کی خاطر اور آپ نے مسائل کے حل پیش کرنا شروع کر دئے ان مسائل کے حل جو ویسے لوگ پیش کرتے ہیں جو بدعت کرتے ہیں تو پھر قوم اور زیادہ مسائل میں گھر جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی اپنی Roots جو ہیں وہ بہت گہری ہوتی ہیں۔اور وہ جب کوئی بات کرتے ہیں تو وہ Interralised نہیں ہوتے تو ان کے جو خیالات ہوتے ہیں وہ واقعی ہمیں کچھ روشنی دکھاتے ہیں نئے مسائل کو حل کرنے میں لیکن اس میں دو قسم کے لوگ ہیں میرے خیال سے ایک وہ جو خالصتاً فکر کے ذریعہ اور ٹھوس دلائل کی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جو سوچتے ہیں تحقیق کرتے ہیں خاصا وقت لگاتے ہیں اس کے بعد جو لکھتے ہیں اس کو دوبارہ سے دیکھتے ہیں اور لوگوں سے Discuss کرتے ہیں پھر جا کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں چند لوگ ایسے ہیں جن کے اپنے اندر گرہیں لگی ہوئی ہوتی ہیں تو باوجود اس کے ان کا اپنی Roots کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ ہے۔ان کی اپنی جو عادات ہیں ان کے اپنے جو طریقۂ کار ہیں وہ ان کی Roots میں ہیں جو ان کے بنیادی اقدار ہیں بھی اس سے ان کو کچھ خاص توازن نہیں ہے تو ان کے اندر اپنی گرہیں لگی ہوئی ہیں اس قسم کے لوگ باوجود اس کے ان کو تمام تر اختیار ہے۔زبان کے اوپر بھی فکر بھی اچھی ہے سب کچھ ہے لیکن ان کی ایسی غلطی کہ

جوش میں آکر جذبات میں آکر تو زیادہ تر شعراٗ حضرات موسیقی کا ہیں فنکار ہیں ان کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کیونکہ ان کے اندر تلاطم جو ہے وہ اتنا زیادہ ہے ان کے اندر اتنی بھی فرصت نہیں ہے کہ وہ بیٹھ کر سوچتے ہوں۔ اور اس کو بعد میں کس طرح سے بیان کریں کہ دوسرا اسے سمجھ سکے تو ان کا ہم لوگوں کے ساتھ جو Connection ہوتا ہے وہ جذباتی ہوتا ہے وہ لوگ جو خود بھی سوچ رہے ہیں وہ قطع نظر اس کے تو ان لوگوں کا جو طریقۂ کار ہے وہ ایک دم غلط ہے لیکن وہ بات کرتے ہیں وہ ہمارے دل پر اثر کرتی ہے اس کے مقابلے میں جو آپ نے دیکھا یہ سوچ کے اس کو ہم پرکھتے ہیں کہ آیا اس کو ہم اقرار کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں جذباتی طور پر ہمارے بیچ میں آسکتے ہیں تو جوش صاحب کو لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک شاعر تھے محقق نہیں تھے وہ تحقیق کر کے بیٹھ کے کوئی ٹھوس بات نہیں لکھتے تھے۔ وہ جا کر تقریریں نہیں کرتے تھے۔ وہ دوسرے وہ لوگ جو تحقیق کر رہے تھے ان کے ریسرچ لیب میں جا کر چاہے وہ Sound Science ہو یا Physical Science ہو وہ اس میں پانچ سال لگا کر P.H.D کی Thesis نہیں لکھتے تھے۔ ان کے دل میں جو آتا تھا جو اتر رہا تھا اسے وہ کہتے تھے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ان پر جو اتر رہا تھا وہ صرف اس دور میں جس زمانے میں وہ لکھ رہے تھے وہ بہت Relevant تھا۔ اس زمانے میں بلکہ بعض چیزیں ایسی ہیں ان کی اہمیت آج زیادہ ہے۔ آج جو ہمارے مسائل ہیں اس میں وہ کہیں زیادہ رہنمائی کرتے ہیں اور اس وقت جو مسائل ہیں میں سمجھتا ہوں تین مسائل جو ہیں دنیا کے وہ بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ قوم کی تشکیل کس طرح سے ہوئی کہ ہر آدمی وہ کرے جو کسی ایک کتاب میں کسی نے لکھ دیا ہو۔ یا اس طرح سے کی جائے قوم کی تشکیل کہ اس میں ہر آدمی کو Diversity of Thought ہو۔ freedom ہو ۔ ہر آدمی وہ کرے جو اس کے دل میں آئے بہ نسبت اس کے کہ ہر آدمی وہ کرے جو کوئی ایک آدمی چاہ رہا ہے تو اس کے لئے میرے خیال سے جب میں دیکھتا ہوں بڑے بڑے شعراٗ کو اپنے یہاں تو خاص طور سے ماضی قریب کے جو شعراٗ ہیں تو ان میں اقبال اور جوش کا نام خاص طور سے آتا ہے۔
جب میں اقبال کو دیکھتا ہوں تو مستقل ایسا لگتا ہے کہ ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے'' اس کے مقابلے جوش صاحب کی منزل میرے خیال سے یہ تھی کہ.......

منزل تری ہے وادیٔ گنگ وجمن سے دور............

پنجاب و کاشمیر و بہار و دکن سے دور
پاپا و پیر، مولوی و برہمن سے دور
دین و رسوم و نسل و زبان و وطن سے دور
تیرا وجود فخرِ نظامِ حیات ہے
تو محض ایک ذات نہیں کائنات ہے.............وغیرہ وغیرہ

جوش کے نزدیک انسان...........

نہ وابستۂ آسماں نہ پابندۂ زمیں
اقرار نہ انکار نہ دنیا ہے نہ دیں

تو یہ ان کے لئے بڑی معتبر چیز ہے کہ جتنی Diversity ہے کسی چیز سے آپ کی نہ Nationality سے ہے آپ کو نہ قوم سے نہ مذہب سے ہے نہ علاقے سے ہے۔آپ پر آج کل کے زمانے میں یہ بڑی خوبصورت بات ہے۔ میں آج اگر کسی سے یہ بات کرتا ہوں سوچنے والوں سے اور یہ کہتا ہوں ہمارے دیش میں ایک ایسا بھی شاعر ہے کہ جو اس زمانے میں یہ بات ان لوگوں سے کہہ رہا تھا تو ان کو یہ بڑی بات سمجھ میں آتی ہے تو ایک مسئلہ یہ ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کے حوالے سے بات ہو رہی تھی اس میں میرے خیال سے یہ مردوں کا مسئلہ ہے اور رہے گا یہاں تک کہ اگر ہم ایمانداری سے دیکھیں تو انڈیا میں تو یہ الزام مردوں پر لگ گئے ہیں اور صحیح لگ گئے ہیں اس وجہ سے کیونکہ ابھی ہم لوگوں کو بہت دور جانا ہے اس سلسلے میں اس بات کو لے کر میں عرض کروں گا کہ نسل اور جنس زیادہ اہمیت نہیں رکھتے دیکھنا یہ ہے کہ آپ کے تخیل کیا ہیں۔آپ کی فکر کیا ہے آپ کے جذبات کیا ہیں اس میں یہ ماننا بالکل صاف بات ہے کہ عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہیں۔ جسمانی لحاظ سے تو فرق ہے جو ہمارے جذبات ہیں اس میں جو ہمارا Cultural back ground ہے جہاں سے ہم آ رہے ہیں وہ Reflect کرے گا تو جوش صاحب پر یہ الزام لگانا کہ ان کی عورتوں کی طرف بہت زیادہ جو نظر تھی وہ خراب تھی آج کے حساب سے صحیح بھی ہے لیکن آج اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے کہ ہر مرد اگر اپنے گریبان میں جھانکے آج بھی تو اس میں کچھ نہ کچھ وہ چیزیں نظر آئیں گی.......تیسرا مسئلہ وہ یہ ہے کہ میرے خیال سے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے چاہے وہ

کرسچن ہوں چاہے وہ جیوز ہوں، ہندو یا مسلم ہوں سب نے بڑی پریشانی میں ڈال دیا ہے اس دنیا کو۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو Rationally سوچ رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اپنی اپنی کتابیں لئے ایک دوسرے کا سر کاٹنے پر تلے ہیں جوش ایک ایسی ہی ہستی تھے کہ جن کے اوپر اس وقت بھی اتنا احساس ہو چکا تھا یہ خیال غلط ہے میرے خیال سے اس لحاظ سے اقبال اتنا نہیں سمجھ سکے۔

فاطمی:۔ بہت شکریہ عباس زیدی صاحب۔ آپ نے بہت اچھی اور بہت کام کی باتیں اٹھائیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جو باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں وہ غور طلب بھی ہوتی ہیں اور بحث طلب بھی ہوتی ہیں آپ نے ایک طرف یہ فرمایا کہ جوش سے بہ حیثیت مفکر و فلسفی توقع لگانا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ Form کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تخیل کی فکر کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے تو کہیں اس میں ہلکا سا تضاد نظر آیا کہ آخر جوش کو ہم کن حوالوں سے دیکھیں۔ فکر کے حوالے سے یا ان کی صرف شاعری، فن اور عہد کے حوالے سے۔ تو عام طور سے خیال ہے کہ جو ہمارا Classical Poet ہوتا ہے، جو عظیم شاعر ہوتا ہے اس کے یہاں ایسے افکار و اقدار ہوتے ہیں جن کا رشتہ ہر دور کے مصائب و مسائل سے ہوتا ہے۔

عباس زیدی: فاطمی صاحب معاف کیجئے گا میرا مطلب یہ نہیں تھا میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ شعوری طور پر علم حاصل کریں اور شعوری طور پر آپ نے جو علم حاصل کیا ہے اس کی بنیاد پر نتائج اخذ کریں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لاشعوری طور پر آپ کے اندر جو کچھ جذب ہو گیا ہے اس کو اس طریقے سے پیش کریں کہ دوسرے کے دل پر اس کا اثر ہو میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جوش صاحب اس Category کے مفکر نہیں ہیں کہ جس میں انھوں نے بیٹھ کر سوچ کر دوسرے لوگوں سے بات کر کے مشورہ کر کے اور پھر اس طریقے سے لکھا ہو کہ پھر وہ بات ہمیں سمجھانے کے لئے خاص طور سے لکھی گئی ہو جیسا کہ Phd یا اسکالر جیسا کہ ایک سائنٹسٹ کرتا ہے انھوں نے جو کچھ بھی جذب کیا وہ فکر کے لحاظ سے Interalised ہو گیا لاشعوری طور سے جہاں تک کہ اُنکی Trowing ہے میں وہ سمجھوں گا کہ اُنکی Language جو ہے وہ ایسی چیز تھی جسے ہم لوگوں نے غور سے پڑھا دیکھا، بڑی اچھی اُن کی زبان تھی لیکن جب انکی فکر کا اندازہ لگایئے پھر آپ کو یہ احساس ہو

تا ہے کہ یہ تو ایک بہت بڑا مفکر تھا انھوں نے جو باتیں کہیں ہیں اسکی Root تازہ مسائل سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں ۔۔۔۔۔۔اور اس خوبصورتی سے کہی ہیں انھوں نے کہ آج بھی تازہ لگتی ہیں ۔۔۔میں نے کسی حد تک خیام کو بھی دیکھا فیض کو بھی اور دوسروں کو بھی جن سے میری ذاتی دلچسپی ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آج بھی ایک مفکر کی حیثیت سے جوش صاحب کو بڑے بڑے ناموں کے سامنے رکھ سکتا ہوں اور انکا مرتبہ اونچا دیکھتا ہوں۔

فاطمی:۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ آپ گفتگو میں دوبارہ شریک ہوں دیکھئے بے حد سنجیدہ پہلو ہمارے سامنے آ گیا ہے بحیثیت مفکر بھی عباس زیدی صاحب نے انکو ایک بڑی شخصیت اور بڑا مفکر مانا ہے اور اس حد تک مانا ہے کہ پہلے تو یہ کہا کہ وہ اقبال سے بھی آگے تک جاتے ہیں پھر بعد میں یہ کہا کہ کسی بھی مفکر اور شاعر کے ساتھ انھیں رکھا جا سکتا ہے لیکن ہمارے جو ناقد ہیں دانشور ہیں جن میں ترقی پسند مفکر اور دانشور بھی شامل ہیں وہ اکثر یہ کہتے آئے ہیں کہ جوش کے یہاں کوئی باقاعدہ و باضابطہ منضبط فکری نظام نہیں پایا جاتا فکر و خیال کی کوئی منطقی و استدلالی ترکیب و تنظیم نہیں ملتی ایک رومانی احساس ہے وہ چلتے تو ہیں فکر کے ساتھ لیکن ایک رومانی جذبہ اور بہت جلد بہت کچھ پا لینے والا جذبہ جو Romance سے ہی پھوٹتا ہے وہ انکو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔خارجی سطح پر اُن کی فکر، یہ میرا خیال نہیں ہے بلکہ ہمارے پیشے ور نقادوں کا خیال ہے اور عباس زیدی صاحب یہ کہہ رہے ہیں تو سچائی ان دونوں کے بیچ میں کہیں ہے تو اس سچائی کو آپ کس طرح لیتے ہیں۔

اقبال حیدر:۔ معاف کیجئے گا یہ جو گفتگو ہو رہی ہے نا جو عباس صاحب کہہ رہے ہیں یہ تھوڑی سی اس لحاظ سے گنجلک ہو رہی ہے کہ ایک طرف ہم لوگ جوش کو مفکر ماننے سے گریزاں ہیں مفکر تو میرے خیال سے اگر مفکر کا لفظ ہٹا دیا جائے اور ایک یہ کہ جو آدمی فکر انگیز گفتگو یا خیالات رکھتا ہے تو وہاں جوش زیادہ فٹ ہونگے ایک تو یہ ہوا دوسری چیز یہ کہ جو آپ نے سوال کیا جسکا جواب ڈاکٹر صاحب ابھی دیں گے یقیناً باضابطہ نظریہ یا ضابطہء اخلاق موجود نہیں تھا۔ یقیناً نہیں تھا جوش کے پاس لیکن جب ذرا اسکا جائزہ لیں کہ فرض کریں کہ اقبال کے پاس تھا اور جتنے وہاں ترقی پسند شعراء ہیں ان کے پاس ہے لیکن وہ ضابطہء اخلاق کیا ہے؟ ایک بہت بڑی سی ٹرین جا رہی ہے میں نے اپنی چھوٹی سی بوگی لے

آ کر گھسیڑ دی اور اس کے ساتھ وہ چلنا شروع ہوگئی اقبال کا جو ضابطہء اخلاق تھا وہ اصلاح کے محض تھا اور یہاں جو تھا وہ مارکسزم کے ساتھ تھا تو اپنا ذاتی کسی کا کوئی سوچا ہوا ضابطہء اخلاق یا کوئی فکر نہیں موجود تھی وہ تو یہی تھا کہ یہ چیز وہاں آزمائی ہوئی تھی اسکو یہاں پر رکھ لو اب اُس پر آپ اڑ گئے کہ جوش اور فراق مجھے دو ہی آدمی نظر آتے ہیں اس لئے میں جوش اور فراق کا ساتھ ہی ساتھ نام لیتا ہوں جب تہذیبی اور فکری گفتگو ہوتی ہے ان لوگوں کو کسی چیز پر اعتبار نہیں ہے وہ کہتے تھے ہو سکتا ہے سب کچھ صحیح ہو سب کچھ غلط ہو یا پارشلٹی غلط ہو اس کو تلاش کرو وہ وہاں تھے تو ان کی پہلی خشت اوّل جس کو کہا جانا چاہئے وہ یہاں سے رکھی جاتی تھی کہ :۔

غرض ہے علم سے اے جوش کچھ ملے تو خدا
اٹھا بھی پردہ تحقیق ہر چہ بادہ باد

تو اگر جوش کے پاس اخلاق ہے اگر کہا جائے تو ان لوگوں کا جو ان کے ہمعصر ہیں بڑے شاعر یا ان کے بعد کے شاعر اور ساتھ کے شاعر ہیں یہ بھی دیکھیں گے ان کے ضابطۂ اخلاق کو own up کر کے اسکو اپنے ضابطۂ اخلاق کا Part بنا لیا تو وہ Infact ان کا اپنا نہیں ہے وہ تو ایک مذہبی رویّہ یا نظریاتی رویّہ ہے جس سے وہ منسلک ہو گئے۔

فاطمی :۔ اقبال حیدر نے بہت اچھے نکتے اٹھائے ایک میں اور ٹکڑا جوڑ دوں کہ کیا انکو باقاعدہ مارکسی مفکر یا مارکسی قسم کا کوئی شاعر کہا جا سکتا ہے جیسے فیض تھے جیسے بعض دوسرے ترقی پسند شعرأ تھے اسلامی فکر اقبال کی تھی اشتراکی فکر فیض کی تھی جوش اس طرح کے کسی باضابطہ فکر سے جڑے ہوئے تھے یا نہیں؟

قمر رئیس :۔ دیکھئے کسی بھی بڑے شاعر کا کسی بھی فکری نظام سے جو پہلے سے موجود ہے۔ اس سے جڑنا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر آپ بڑے شاعروں کو شروع سے دیکھیں مولانا روم ہوں شیکسپئر ہوں یا پھر گوئٹے یا ٹیگور ہوں یہ لوگ کسی فکری نظام سے جڑے ہوئے نہیں تھے لیکن ان کی شاعری میں ان کی تحریروں میں نثری اور شعری تحریروں میں جب ہم پڑھتے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں کچھ افکار ملتے ہیں تصورات اور خیالات ملتے ہیں کچھ ایسے سروکار ملتے ہیں انکے Concern سماج کی ان طاقتوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ سماج کی فلاح اور سماج میں جو مظلوم

طبقہ ہے پچھڑا طبقہ ہے اس کا درد اپنے دلوں میں محسوس کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ ایسی پیغمبرانا حیثیت اسی وقت بنتی ہے جب دکھی انسانیت سے پوری طرح اپنے آپ کو جوڑ سکیں اور تقریباً تمام بڑے شاعروں نے تخلیق کاروں نے اپنے کو جوڑا ہے۔ ایک بات کہوں ہمارے عباس زیدی صاحب نے اور بڑے سماجی تاریخی اور اس عہد کے سیاق وسباق میں باتیں کہی ہیں لیکن میں یہاں ذرا سا آپ کو تخلیقی عمل کی طرف لے جاؤں گا۔ نثر لکھنے والے یا سماجی موضوعات پر لکھنے والے جو ہیں ان کا طریقۂ کار تجزیاتی ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان کا اچھی طرح تجزیہ کرتے ہیں اور بعد میں پورے استدلال کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ اس کے برعکس شاعری یا مصوری یا موسیقی ایسے فنون ہیں کہ جن کی جڑیں افکار ونظریات سے زیادہ اس عہد کی تہذیب میں پیوست ہوتی ہیں اور اس قومی تہذیب سے اٹھ کر بین الاقوامی انسانی تہذیب سے وہ اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ آفاقی تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں پھر ان کے یہاں آہستہ آہستہ فکری عظمت کے عناصر اجاگر ہوتے ہیں۔
اب آپ دیکھیں شعروادب میں یا تخلیق کار میں جو تخلیق کا عمل ہوتا ہے وہ یوں تو بڑا پیچیدہ ہوتا ہے میں صرف ایک مثال آپ کو دوں اس میں ہوتا یہ ہے کہ تین مدارج ہیں جب شاعر یا تخلیق کار کوئی حادثہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل جو ہوتا ہے وہ Sensational ہوتا ہے۔ وہ ردِ عمل جسمانی ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ حادثہ اس کے اندر ٹھہراؤ اختیار کرتا ہے تو وہ ایک Emotion ایک جذبہ بن جاتا ہے اُس کے اندر اور وہ جذبہ بھی بڑا شدید ہوتا ہے۔ اور اس کو بے چین رکھتا ہے اور اسکو تڑپاتا ہے۔ جس طرح جوش کو تڑپاتا رہا ساری عمر اب اگر اس سطح پر شاعر کسی بھی مجبوری کے تحت اس جذبے کو ادا کر دیتا ہے۔ شاعری میں تو وہ شاعری ہم کہتے ہیں اموشنل ہے اور اکیٹیشنل ہے، رومانی سطح سے اوپر نہیں جا پاتے سبب یہ ہے کہ وہ اصل میں Creative Experience بن نہیں پاتا جیسے کہ ہمارے رومانٹک شعرا نے کیا اصل میں اس عمل میں وقت لگتا ہے اور تخلیقی تجربے تک پہنچتے پہنچتے وہ حادثہ جو اسکے اندر برپا تھا اسمیں اسے کئی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے اس کا ہمہ گیر تخیل اور اس تخیل میں دنیا بھر کی معلومات اور مسائل کا ادراک وعرفان شامل ہوتا ہے۔ اسمیں اسکا سماجی شعور ہے تہذیبی شعور ہے۔ اس میں وہ فکری خزانے ہیں جو اس نے مختلف وسائل سے حاصل کر کے اپنے اندر جذب کئے ہیں یا جذب کرنے کی کوشش کی ہے تو جب وہ تخلیقی

تجربہ بنتا ہے تو اس پروسس سے ضرور گذرتا ہے اور ہم بڑے شاعروں کو اگر دیکھیں وہ گوئٹے ہوں یا ٹیگور ہوں یا دوسرے بڑے شاعر ہوں انکے یہاں بڑی شاعری وجود میں آتی ہے زندہ رہنے والی دیرپا شاعری وہ تخلیقی تجربہ کے عمل سے ضرور گذرتی ہے تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عباس صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس میں ہمیں صداقت نظر آتی ہے لیکن وہ صداقت ادھوری سی ہے جوش کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری کا ایک حصہ وہ ہے جو احتجاجی ہے اور ہم اس کے قدروقیمت کے قائل ہیں آگے جب اگلے مرحلہ کی بات آئے گی تو ہم وہاں اس کے بارے میں ذکر کریں گے اور آپ لوگ بھی میرا خیال ہے کہ ضرور تسلیم کریں گے دوسرا وہ ہے جو Realistic ہے ان کے گہرے مشاہدات پر مبنی ہے مثلاً آوازہ حق، فطرت کے حسن پر نظمیں یا رباعیات۔ ان میں جو تجربے ہیں وہ تقریباً تخلیقی تجربے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور جس نے سماج کے تئیں ان کے جو Concerns ہیں مثال کے طور پر باطل سے خطاب، یا اس طرح کی دوسری نظمیں جس سے اس زمانے کا جو معاشرہ تھا اس میں رسمی مذہب کی جو بیجا گرفت تھی اس کے خلاف ایک طرح کا protest کرتی ہیں اس کے اندر ان کا دکھ کرب اور درد صاف نظر آتا ہے۔ ہم جو ان کے Relevance تلاش کر رہے ہیں آج ان کے Relevance زیادہ ہیں جتنا کی اس زمانے میں تھی تو اس طرح کی اور بیشمار نظمیں درمیانی نظمیں ہیں جوش کی جس کو میں سمجھتا ہوں کہ تقریباً وہ تخلیقی تجربے کی سطح تک پہنچ جاتی ہیں اور تیسری سطح وہ ہے جس میں سچ مچ انھوں نے ایک انفرادی اپنی فکر وضع کر کے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے وہ ان کی فکری شاعری ہے۔ اور اس میں بیشمار نظمیں آتی ہیں اور آپ لوگ جانتے ہیں کہ جس کو اگلے دور میں پرکھیں گے تو اس طرح ہم کسی ایک شاعر پر اقبال کی شاعری کو لے لیجئے اس میں بھی آپ کو وہی تین قسمیں ملیں گی۔ شکوہ جوابِ شکوہ اور اس طرح کی دوسری نظمیں ملیں گی تو درمیانی نظمیں پھر اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ہیں جیسے خضرِ راہ، مسجدِ قرطبہ، جیسی دوامی تخلیقات۔ اس لئے کہ ان کے اندر جس تخلیقی عمل سے اقبال گزرے ہیں وہ بہت پیچیدہ رہا ہے اور اس میں ایک کائناتی سطح پر جا کر سوچا اور تخلیق کیا گیا ہے یہ بڑا نازک عمل رہا ہے۔ ٹیگور کی شاعری پر بھی بہت سے الزامات عائد کئے گئے اور ان کے یہاں بھی وہی عمل ملتا ہے اس لئے میں عرض کروں گا کہ جوش کی شاعری کی عظمت اور وقعت کو تلاش کرنے اور دریافت کرنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کئی طرح کے عوامل کو

لے کر چلنا پڑے گا۔

عباس زیدی: ۔ڈاکٹر صاحب میں یہاں پر ایک بات عرض کروں کہ جو لفظ استعمال ہو رہا ہے مفکر اور شاعری کا۔اس میں میرے خیال سے تیسرا لفظ بھی ہے محقق کا سوال یہ ہے کہ وہ محقق تھے کہ شاعر تھے یا اسمیں سے Mixture تھے۔میرے خیال سے انھوں نے خود کہا ہے کہ

؎ رگ رگ میں تفکر نہ اتر جائے اگر..........

تو علم اور فکر میں تھوڑا سا فرق ہے۔محقق جو ہے وہ علم کی طرف جاتا ہے فکر جو ہے وہ اپنے اندر ڈوب کر وہ Solution کرتے ہیں جو Unusual ہیں۔اور اسکی کوئی Form.......نہیں ہے آپ کے پاس آپ اسکو Justify نہیں کر سکتے ہم آپ اگر خوش قسمت ہیں تو آپ کا جو Solution ہوگا آپ کی جو تاریخ ہے روایت ہے انسانیت ہے اس سے وہ منسلک ہوگا اگر نہیں ہے تو میرا خیال یہ ہے ہم لوگ اس بارے میں تھوڑا سادہ ہو جاتے ہیں کہ اگر میں خود کرتا ہوں۔میں نے بہت انگریزی میں Published کیا ہے لیکن میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ اس میں سے وہ میرے دل کی آواز ہے بہت تالیاں بجتی ہیں انعامات ملتے ہیں مگر وہ الگ بات ہے اس کے مقابلے میں میرے اندر جو گرہیں لگ چکی ہیں وہ کہاں سے آتی ہیں کیسے آتی ہیں اسکا اردو سے تعلق ہے یا الگ سے نہ سوچتا ہوں، نہ پڑھتا ہوں، نہ لکھتا ہوں۔مجھے کسی حد تک یہ احساس ہے کہ جوش صاحب کو میں پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کے اندر جو دھڑکنیں ہیں انھوں نے بہت وقت لگایا ہے ان کو جذب کرنے میں فکر کرنے میں اور پھر اسکے بعد جو ان کی بہت سی چیزیں ہیں وہ ان کا تفکر ہے وہ ہمارے Emotion ہیں تحقیق میں ان کو میں تقریباً زیر مانتا ہوں لیکن تفکر میں اور بلکہ میں کہوں گا ترنم میں بھی میں ان کو جب غور سے دیکھتا ہوں تو بعض باتوں کو جس طریقے سے انھوں نے دیکھا ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے اندر کچھ جذب ہو گیا تھا وہ اس طریقے سے جذب ہوا ہے کہ ہماری بہترین روایات و اقدار تھیں لیکن ان کے ساتھ ان کی شخصیت تھی جس میں وہ جذب ہوا تھا ان کے عمل کے لحاظ سے اسمیں بعض جو ہماری تہذیب کی گھناونی چیزیں تھیں وہ بہت عیاں تھیں۔

فاطمی: ۔ابھی عباس زیدی صاحب نے فرمایا کی ہم دوسرے زبانوں کی شاعری پڑھتے ہیں تو بہت سارا حصہ ایسا ہوتا ہے کہ جس پر ہم صرف تالی پیٹ کر رہ جاتے ہیں وہ ہمارے دل میں نہیں اترتی تو

جوش پر یہ الزام ہے کہ انکے یہاں کثرتِ الفاظ کو لے کر یعنی ایک منظر کو بیس تیس شعر میں پیش کرتے ہیں اور اتنے مترادفات ہیں لفظیات کی اتنی کثرت ہے کہ کبھی کبھی لگتا ہے کہ وہاں پر بھی صرف تالی ہی پیٹی جاسکتی ہے اور دل و دماغ وہاں کام نہیں کررہا ہے تو آپ نے جوش کا بھی مطالعہ کیا ہے آپ مصطفیٰ زیدی کو بھی بہت پسند کرتے ہیں اور دوسرے شعراً کو بھی پڑھا ہوگا یہ جو الزام ہے ان کے اوپر طول بیانی کا یا الفاظ کی کثرت کا جبکہ اردو شاعری میں میرے خیال میں دنیا کی بھی شاعری قلّت لفظی کی شاعری کہی جاتی ہیں جیسے بیٹری Charge ہوتی ہے۔اسی طرح خیالات بھی Charge ہوتے ہے اسی طرح خیالات بھی Charge ہوں تو اس سلسلے میں اگر آپ کچھ کہنا چاہیں جوش کے حوالے سے یا جو کچھ بھی آپ اسکے بارے میں رائے رکھتے ہوں۔

عرفان حیدر:۔ میں جوش کا ایک عام قاری ہوں دیکھئے اس لحاظ سے خاصہ صحیح ہے کہ شاعری کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے کہ:

''اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''

تو وہ تو بہر حال ہے میرے خیال میں ان کی یہی بہت بڑی طاقت بھی ہے ان کی شاعری کی ......خاص طور سے جوش صاحب کی جن کی قدرتِ کلام ہے وہ ایک طرح سے ان کے اپنے تھے Back Fire بھی کرتی ہے ایک لحاظ سے لیکن اسمیں جو بات ہم لوگ کر رہے تھے قمر رئیس کے ساتھ کے اسمیں لوگ گم ہو جاتے ہیں۔ جوش کا اگر آپ بار بار مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ اسمیں بے انتہا معنیٰ پوشیدہ ہیں کیونکہ ایک سرسری نظر میں وہ نہیں عیاں ہوتا تو یہ تو صحیح اور بہت اچھا تجزیہ ہے جوش صاحب کی شاعری کا۔

فاطمی:۔جیسا کہ مصطفیٰ زیدی کو آپ نے خاصا پڑھ رکھا ہے مصطفیٰ زیدی جوش کو بہت مانتے بھی ہیں اور ان کے اسلوب کی، زبان کی بھی اگر یہ بہت بڑی خوبی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا تو دوسرے شعراً کے یہاں خاص طور سے مصطفیٰ زیدی کے یہاں اس کے اثرات نظر آتے ہیں آپ کو؟

عرفان حیدر:۔ ہاں ہاں نظر آتے ہیں لیکن بہر حال وہ بات تو نہیں ہے جو کم از کم الفاظ کا ذخیرہ ہے جوش سے اس کا تو مقابلہ بھی نہ ہو اور دوسرے شعراً ہیں جیسے جون ایلیا ہیں ان کے یہاں بھی بڑی وسعت ہے لیکن بہر حال وہ بات نہیں ہے۔زیدی کو میں جوش اور فیض کے درمیان کا شاعر

مانتا ہوں۔

فاطمی: ۔کیا آپ اس کو اس طرح سے نہیں کہتے ہیں کہ جوش جس عہد میں آتے ہیں وہ لکھنوٴ اسکول تھا اور عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے ، استادی ، قادر الکلامی اس زمانے میں شعر و ادب کا جو ایک جاگیر دارانہ اپروچ تھا۔امیرانہ یا کہہ لیجئے ۔جوش کہیں اسکا تو شکار نہیں ہوئے ؟

قمر رئیس: ۔میں یہاں تھوڑا دخل دوں گا بلکہ آپ کے سوال پر میرا اعتراض ہے۔دیکھئے یہ بہت سطحی سا سوال ہے اور اسکا جواب بھی ایسا ہی ہوگا ہم کو اس سے ذرا اور بلند ہوکر کے جانا پڑے گا جوش فارسی شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔مشرقی ادب انھوں نے اچھی طرح پڑھا مغربی ادب کا ان کا مطالعہ نہیں تھا انگریزی کا بھی انکا مطالعہ اچھا نہیں تھا یہ ہمیں سمجھ لینا چاہئے تو جوش پر جو اس طرح کے اعتراض کئے گئے ہیں ۔ان کے یہاں لفاظی ہے ان کے یہاں تکرار ہے تشبیہات کی ریل پیل ہے۔ اس میں خیر یہی سچائی ہو سکتی ہے۔

اقبال حیدر: ۔یہ کسی حد تک ہے بھی۔

قمر رئیس: ۔یہ بھی ادھوری بات ہے۔اس لئے کہ ہماری مشرقی شاعری کی جو شعریات جو روایات ہیں وہ مغرب سے بہت مختلف رہی ہیں اس لئے کہ ان کی تہذیب کے سرچشمے مختلف ہیں ہماری تہذیب مختلف ہے اب اس تہذیب پر میں چاہتا تھا کہ کچھ بات چیت کی جائے ایک تو ہمارے یہاں مبالغے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے شاعری میں اور نمبر دو یہ کہ ہمارے صنائع کا ایک مقام ہے پھر یہ کہ ہمارے یہاں جو بھی شاعر ہوتا ہے وہ ایک ساتھ جذبے کی سطح سے اور جذبے کی زبان سے سوچتا ہے مغرب میں آپ دیکھیں استعارہ سب سے اہم ہے شاعری میں ہمارے یہاں تشبیہہ اہم ہے اور تشبیہات کا ایک انبار ہمارے شاعر لگا دیتے ہیں جن سے ہمارا ذوق شعری محضوظ ہوتا ہے۔یہ فارسی شاعری کا ورثہ بھی ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ جوش کی شاعری ہو یا دوسرے شعراُ کی۔ان کے یہاں انفرادیت پسندی کا وہ انداز نہیں ملتا جو مغرب کے Romantic شعراُ کے یہاں ملتا ہے ہم اس سے ہٹ کر سوچتے ہیں ہماری انفرادیت پسندی میں ایک خاص طرح کی جذباتیت بھی شامل ہوتی ہے اور اسکی کیفیت کو بھی ہم سمجھتے ہیں۔تو شائستہ صاحبہ آپ تو یہ سمجھیں کہ لکھنوٴ کی شاعری کے کچھ صحت مند عناصر ہیں جس سے جوش متاثر ہوئے۔یہ فارسی شاعری کے اثرات جو ان کے یہاں ملتے

ہیں اس پر اس طرح کے اعتراضات زیادہ واجب نہیں ہیں وہ مغربی شعر و ادب کے مطالعہ کے تحت کلیم الدین احمد خلیل الرحمٰن اعظمی یا بعض دوسرے لوگوں نے کئے ہیں ہمیں انکو نہاں کرنا پڑے گا اب تو وہ دور گزر چکا۔

فاطمی :۔ ڈاکٹر صاحب نے جو بھی بات کہی ہے شائستہ صاحبہ آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں یا نہیں کرتی ہیں تو آپ اپنے تاثر بیان کریں۔

اقبال حیدر :۔ لیکن اس سے قبل میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ دیکھئے جوش کے بارے میں جو ڈاکٹر صاحب نے کہا بہت ہی Valid point ہے۔ جوش کی جو ایک چیز بڑی Unique ہے جس پر توجہ نہیں دی گئی وہ یہ کہ جوش کے یہاں جو مشاہدے کی قوت ہے وہ تقریباً قمر یباً تخلیق کرنے کی قوت کے برابر ہوتی ہے کیونکہ یہ بڑی انہونی چیز ہے مجھے یہ اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی تو ان کا جو مشاہدہ ہے اب ان دونوں کو ساتھ لے کر چلئے۔ میں نے یہ بات بہت پہلے کہی تھی میرے خیال سے ایک مضمون میں لکھی بھی تھی ایک تو مشاہدہ کی قوت، ایک تخلیق کرنے کی قوت جس کو زور و بیان کہا گیا ہے۔ ان دونوں کا جو ملاپ ہوا ہے نہ یہ بڑا Unique ہے وہ اردو میں تقریباً ناپید ہے۔ اب وہ دیکھتے ہیں جن چیزوں کو جیسے کسان کی نظمیں کوئی بارش کی نظمیں ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ جوش صاحب ایک طرح کے الفاظ جمع کر رہے ہیں لیکن جب آپ ان الفاظ کو جا کے پرکھیں تو وہ ایک طرح کے ہوتے ہی نہیں وہ ہر الفاظ ایک خاص مزاج، خاص رجحان، ایک خاص کیف ایک خاص کیفیت کو وہ دے رہے ہیں اس کی طرف میں نے صرف ایک ہی مضمون میں اشارہ پایا قمر رئیس صاحب نے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ایک کتاب چھاپی تھی اس میں آغا سہیل صاحب کا مضمون پڑھ رہا تھا ابھی پچھلے ہفتے انھوں نے اس معنوی تہذیب کا جو ایک جہان ہے اسمیں انھوں نے اترنے کی کوشش کی ہے اور جب تک آپ یہ نہیں کریں گے آپ جوش ملیح آبادی کو اوپر سے ہی دیکھتے رہیں گے کیونکہ انکا علم نہیں ہوتا ہے۔

فاطمی :۔ اس گفتگو کے بعد شائستہ صاحبہ آپ کیا کہنا چاہیں گی۔

شائستہ :۔ بھائی نے تقریباً اس بات کا جواب جو ہمارے ذہن میں تھا وہ دے دیا ہے کہ جیسا جوش کہتے تھے الفاظ کے سر پیر نہیں ہوتے۔ معنی الفاظ کے سینے میں اتر کے دیکھو تو جوش نے مترادف الفاظ

کا انبار لگا لیا لیکن آپ ایک ایک لفظ دیکھیے تو ایک ہی لفظ کی اتنی شخصیت ہوتی ہے جوش کی زندگی دیکھ لیجئے۔ یہ تاج محل، یہ شاہ جہاں ہے زندگی اسمیں ہر شعر لگتا ہے کہ زندگی کو ایک نئے رُخ سے دیکھتا ہے اور اس میں اس کا مشاہدہ ان کی تخلیق اپنے اس کمال پر ہے کہ اسکو آپ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ اس نظم کو زندگی یا اس طرح کی بے شمار نظمیں ہیں ان کو شاید چھ یا آٹھ اشعار میں بھی سمویا جا سکتا تھا لیکن ہم جوش کا ان شعراءُ سے مقابلہ کرتے ہیں جن کے پاس نہ وہ الفاظ کا ذخیرہ ہے نہ وہ تخئیل کی قوت تو جوش کی یہی انفرادیت ہے اور یہی کمال ہے لیکن ہر لفظ جوش کا کسی مقصد یا کسی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ آپ لوگوں نے اتنا کہہ دیا کہ میں اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔

فاطمی:۔اب میں ایک اور اہم سوال اٹھانا چاہتا ہوں اور یہ میں چاہتا ہوں کہ اسے توجہ سے سماعت بھی فرمائیں اور پھر اسکے بعد اسکو اپنی گفتگو میں بھی شامل کریں۔ خاص طور سے اقبال حیدر صاحب سے کہ میرا اپنا ماننا ہے کہ اس طرح کی شاعری کو لے کے خاص طور سے نقد ونظر کے حوالے سے کہ ہمارے یہاں اردو شاعری میں غزلیہ تہذیب اور غزلیہ شاعری حاوی رہی ہے۔ ایک مصرعے میں دو مصرعے میں اپنی بڑی سے بڑی بات کہہ دینے کا جو ایک مزاج رہا ہے اس نے بہت متاثر بھی کیا بہت کچھ دیا بھی اردو شاعری کو تو شعریات یا شاعری کی تنقید کے اصول بھی اسی پر قائم ہوئے۔ شاعری کرنے یا تصورِ نقد ونظر بھی ہوئے تو صرف ہوا یہ کہ کیونکہ ہماری بہتر شاعری Upper Class کی یا Urbanised Poetry تھی۔ تہذیب وتمدن کی شاعری تھی۔ لہٰذا تنقید کے معیار بھی اسی طرح سے قائم ہوئے تو اس سے جہاں بہت کچھ فائدے پہنچے اور ہمارے پاس غزل کا سرمایہ بھی آیا اور اس کے تعلق سے تنقید کا بھی جو سرمایہ آیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک بات احتشام حسین نے نظیر اکبر آبادی پر مضمون لکھتے ہوئے کہی تھی کہ...........

"اس معیار پرستانہ تہذیب سے جہاں بہت سے فائدے
پہنچے ہیں وہاں کچھ نقصانات بھی ہوئے ہیں۔"

میرے خیال سے نقصان یہ ہوا کہ ہم نے غزلیہ شاعری کے مقابلے میں جو ہماری عوامی شاعری ہے یا Nature P etry ہے یا Epic poetry ہے یا طول بیانی ہے، اس کو ہم نے بہت اہمیت نہیں دی اور یہی وجہ ہے کہ ہم نظیر کو بھی بہت اہمیت نہیں دے پائے اور پورا جو اسکول ہے سودا،

نظیر سے لے کر انیس اور اسی قبیل کے شاعر ہیں ہمارے جوش اور فراق بھی تو اقبال حیدر صاحب میں آپ سے ہی سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جوش کو میرؔ، دردؔ، غالبؔ اور حسرتؔ کے قبیل کا ہی شاعر مانتے ہیں یا پھر جوشؔ کو آپ سودا، نظیر، انیس اور چکبست وغیرہ کے قبیل کا شاعر مانتے ہیں اور یہ جو متوازی دو دھارے ہیں ہمارے یہاں اردو شاعری میں ان دھاروں کے بیچ جوش کو آپ کہاں کھڑا پاتے ہیں۔

اقبال حیدر :۔ فاطمی صاحب ہماری آپ کی تو اس موضوع پر بہت گفتگو ہو چکی ہے پھر بھی عرض کرتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی یہ بات کہی ہے کہ شاعری میں لہجے کے حساب سے جو دھارے ہیں ان میں ایک میرؔ سے چلا ہے اور ایک سوداؔ سے چلا ہے۔ میرا اپنا جو طالب علمانہ انداز ہے یا جو بھی میں نے سوچا سمجھا ہے اس لحاظ سے جتنے بڑے شاعر ہوئے سوداؔ کے لہجے میں میرؔ کے لہجے نے اتنے بڑے شاعر نہیں دیے۔ اس وقت میرے والد اگر ہوتے تو شاید مجھے کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیدیتے۔ لیکن یہ میں سمجھتا ہوں آپ یہ دیکھتے چلے جائیں سودا کے بعد سے اور آپ فیض تک آجائیں آپ کو سودا کا لہجہ جو ہے اسمیں ہمہ گیری ملے گی۔ میر کے لہجہ میں بہت چاشنی بہت دلکشی ہے ۔میر اپنے آپ کو کائنات سے ایک طرح سے منتقل کر کے اور اپنے غم کو غمِ کائنات بنا دیتے ہیں۔ بہت اچھا کرتے ہیں لیکن جو زندگی کی اور مختلف نہج ہیں جہتیں ہیں اس پر وہ جاتے ہیں تو اختصار اتنا ہو جاتا ہے کہ وہی جو آپ کہہ رہے تھے نہ کہ مخصوص غزلیہ شاعری بن جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر معاشرے کو سماج سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے کسی عمل سے چاہے وہ شاعری ہو چاہے وہ نثر نگاری ہو چاہے وہ Painting ہو تو مجھے اسکو قبول کرنے میں کچھ تامل ہوگا۔ دوسری چیز جو اس سے جڑی ہوئی ہے ہمارا تنقیدی رویہ ہے۔ جس پر بہت دفعہ گفتگو ہو چکی ہے کہ جب ہم غزل سمجھتے تھے اور غزل ہماری سہولت پسند زندگی کو بہت سوٹ کرتی تھی اور کرتی ہے تو اس سے ہم پھدک کے جب اکدم مغرب میں پہنچے تو ہم نے مغرب میں بھی سب سے Short Form جو ان کی نظموں کی ہوتی ہے نہ اسکو سمجھ لیا اور اسی پر گڑھنا یعنی مکھی پر مکھی بٹھانی شروع کر دی حالانکہ مغرب میں بہت ہی خطہ بہت ضخیم سرمایہ موجود ہے لمبی نظموں کا Epic Poem کا ہم لوگ وہاں تک جاتے ہی نہیں۔ ہم لوگ جب مغرب کے حوالے آج کل سے گفتگو کرتے ہیں بار ہا دیکھ چکا ہوں تو ان کے Short نظموں کے پیرامیٹرس

ہیں۔اس سے ہم نے Long نظموں میں تھوڑا بہت پڑھا بس علامہ بن گئے کھٹا کھٹ چھاپنے لگے اپنی تنقید تو اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو آپ کو دیکھنا پڑے گا اب آپ کے سوال کی طرف زیادہ مرکوز کرتے ہوئے اپنے جواب کو سمیٹتے ہوئے میر، غالب کو دیکھتے ہیں اپنے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ غالب کا جو معنوی ورثہ تھا نہ کہ معنی الفاظ کے جو ایک Optimum معنی ہیں اسمیں اس شاعری کی Intensity شاعر کو Compel کرتی تھی کہ وہ اسمیں استعمال کریں وہ جو غالب کا ورثہ تھا بالکل لا وارث تھا۔غالب کے بعد اس ورثے کی کسی نے پاسداری کی ہے تو وہ جوش ملیح آبادی نے کی ہے۔ میں اس لحاظ سے ہمیشہ جوش کو غالب کا معنوی فرزند سمجھتا ہوں۔اچھا اسمیں لوگوں کو بڑا تامل ہوتا ہے کیونکہ غزل کا پروردہ ذہن ہے وہ کہیں گے کہ جوش نے الفاظ کے انبار لگا دیئے۔یا تو ہم میں خود اتنی محنت کرنے کا جذبہ ہو کہ جن چیزوں کا دعویٰ کر رہے ہیں جوش کی شاعری میں اس کو اگر پانچ دس سال کا ٹائم لگایا جائے نہ تو اس میں مل سکتا ہے دو چار برس کا کام نہیں ہے نہ دو چار مہینے کا کام ہے کہ آپ کو یاد ہے جوش کے وہ معنوی Shade دریافت کرنے ہونگے اور مثال کے طور پر لوگوں کو دے کر سمجھانا ہوگا کہ دیکھئے یہ جہاں پر لفظوں کا انبار سمجھ رہے تھے وہ انبار ہے ہی نہیں وہ ایک کیفیتوں کی گنگا جمنی ایک picture ہے۔بہت ہی بڑی اور اسمیں سے آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ آدمی یہ کیوں کرتا ہے کیونکہ وہ اسکو اپنی Logic کا part بنانا چاہتا ہے۔جوش یہ کرتے ہیں پورا ایک منظر نامہ Create کرتے ہیں۔اسی میں گڑ بڑ بھی ہوئی کئی جگہ ان کے یہاں محض لفاظی ایسی ہے کہ اس میں صرف وہ Enjoy کر رہے ہیں اور انھوں نے ایک مترنم فضا قائم کر دی وہ الگ ہے لیکن اس میں جو زیادہ اچھی نظمیں اور جو زیادہ بڑی شاعری جو ہے ان کی ۱۹۶۰ء کے بعد کی وہ اس کی بات کر رہا ہوں وہاں یہ جوش آ کر منظر نامہ Create کرنے کے بعد ان تمام مشاہدات کو لا کے اپنے آخری تین یا چار شعروں میں استدلال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔یہ سب کچھ تو ہم دیکھ چکے ہی لیکن اسکا جو نتیجہ ہے وہ یہ ہے کہ...... مرثیہ جس کو وہ مسدس کہنے پر اصرار کرتے تھے وہ تھے بھی مسدس۔اسمیں بھی یہی کیا۔مذہبی شاعری جو جوش کی کہی جاتی ہے اس میں بھی جوش کے یہاں یہ عنصر نمایاں ہے کہ وہ مستقل ایک طرزِ استدلال پہ چلتے رہتے ہیں میں نے اسکو ایک وہ آپ سے کہا بھی کہ زیدی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا بھی تھا کہ ان کے ثابت کرنے کی دھن جس وقت میں نے جملہ پڑھا تھا پتہ نہیں ۷۲ء

میں تو مجھے بہت اچھا لگا تھا کہ اس آدمی نے جوش کا نقطہ پکڑا ہے کہ جوش کو کیا چیز Drive کرتا ہے جوش ہر وقت یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جو وہ دیکھ رہے ہیں وہی دکھا بھی دیں۔ کتنے کامیاب ہوتے ہیں کتنے نہیں یہ بعض اس سے کہیں زیادہ جوش کا مشاہدہ کامیاب ہو سکتا تھا لیکن ہمارے جو Fictions ہیں ان کو تقویت مل گئی۔ جغرافیائی تقسیم سے اگر جغرافیائی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو جوش کی جو دریافت ہے اسکی ہم کو ضرورت ہی نہیں کرنی پڑتی وہ تو Prevail کر رہے تھے۔

فاطمی :۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب اس قبیل کا ایک سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں جو بہت اہم سوال ہے۔ میرے نزدیک اور آپ سے بہتر کوئی اس کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ ابھی آپ نے اپنی گفتگو میں Agitational Poetry کا ذکر کیا۔ ہمارے یہاں ترقی پسند شاعری سے قبل اور بالخصوص ترقی پسند تحریک کا جو سرمایہ ہے جوش سے لیکر نیاز حیدر تک جسمیں Agitational شاعری Protest Poetry بھری پڑی ہے اور جسکو ہمارے معیار پرست نقادوں نے Loud شاعری اور خطابیہ شاعری اور نعرے بازی کی شاعری کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی۔ میرا اپنا ماننا ہے کہ Protest Poetry جو ہوگی اور Agitational Poetry جو ہوگی وہ Loud تو ہوگی وہ Loudess اس کا حسن ہوگا عیب نہیں، کیونکہ ہر رنگ شاعری کا اپنا کردار اور معیار الگ الگ ہوگا ہی میں نے عرض کیا کہ غزلیہ شاعری کے پیمانے سے اگر ہم اسطرح کی شاعری کا محاسبہ کریں گے تو ہم لڑکھڑائیں گے اور منہ کے بل گریں گے اور انصاف نہیں کریں گے تو کیا آپ نہیں سمجھتے کہ جوش سے لیکر نیاز حیدر تک Protest Poetry یا انقلابی Poetry ہے۔ اس کے ساتھ تنقید نے اور ترقی پسند تنقید نے اس طرح کا انصاف نہیں کیا جیسا کہ اس نوع کی شاعری کو جانچنے پرکھنے میں کیا جانا چاہیئے۔

قمر رئیس :۔ فاطمی صاحب نے دراصل سب سے اہم اور سب سے ضروری سوال کیا ہے ذرا سا آپ بھی اس پر غور کریئے اسی ایک سوال پر ہم لوگ طویل بحث کا آغاز کر سکتے ہیں اور اس کے اسباب بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ آخر کیوں اس شاعری کو Down Grade کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں جعفر زٹلی اس معاملے میں سب سے پرانا شاعر اور اسکی Agitational شاعری جو بہترین شاعری تھی سوائے اس کے کہ وہ بے چارہ اسی جرم میں مارا گیا۔ قتل کیا گیا۔ لیکن اسکے یہاں

نظیر آکبرآبادی ہیں، سودا ہیں اور شہرِ آشوب لکھنے والے بے شمار شاعر ہیں جس وقت ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تھا اس وقت بہت سے شہرِ آشوب، طویل نظمیں لکھی گئی ہیں یہاں تک کہ میر کے یہاں بھی ایسی احتجاجی شاعری ملتی ہے اور وہ سلسلہ پورا چلا آتا ہے۔ پہلے تو ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ مشرق کی شاعری میں اسکی بڑی اہمیت رہی ہے۔ بیانیہ شاعری کی اہمیت رہی ہے، احتجاجی شاعری کی اہمیت رہی ہے اور فارسی میں بھی، اردو میں بھی مغرب میں جو طویل نظموں کا سلسلہ رہا ہے وہ مفکرانہ رہا ہے۔ قدیم دور کو لیں یا درمیانی دور کو لیں مثلاً ملٹن اور الیٹ۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اس میں میں نہیں جاؤں گا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جوش تک آپ دیکھیں انحراف کی شاعری، مزاحمت کی شاعری، بغاوت کی شاعری، فلسفہ کی شاعری، بنگال کا ایک شاعر ہے نذرالاسلام اسکی ساری شاعری بغاوت کی شاعری ہے۔ آج یہ عالم ہے اور اب تک پچھلے پچاس سالوں میں یہ عالم رہا ہے کہ ہر بنگالی آدمی نذر الاسلام کی ایک بت کی طرح ایک دیوتا کی طرح پرستش کرتا ہے۔ اگر وہ کسی گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں ہزاروں عورتیں آتی ہیں اور ان کے قدموں پہ آکر پھول نچھاور کرتی ہیں تو اسلئے کیونکہ انھوں نے اس اسلوب کی شاعری کو شاعری کے زمرے سے خارج نہیں کیا۔ غزل کی روایت وہاں نہیں تھی وہاں مغربی شاعری کی روایت جو ہمارے یہاں ایک دم سے وارد ہوئی اور ہمارے یہاں کچھ دانشوروں نے اسے ابھارنے کی کوشش کی وہ بھی وہاں نہیں رہا وہ ٹیگور کی شاعری میں مغرب کے بڑے اثرات ہمیں ملتے ہیں تو ہمارے یہاں جسے Agitational شاعری کا نام دیا گیا ہے Moderate احتجاجی کا نام دیا ہے حقیقت میں وہ میرے خیال میں بھی نوع انسان سے وابستگی اور محبت اور اسکے دکھ درد کو شدت کے ساتھ اپنانے اور اسکو بیان کرنے کی شاعری ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس طرح کی شاعری کو جو نقصان پہنچایا وہ ہماری غزل زدگی نے اس غزل کی شاعری سے ہم اس درجہ مسحور اور متاثر رہے ہیں کہ پھر مزاحمتی شاعری کا تاثر ہم اس طرح سے قبول نہیں کرتے جس طرح سے ہمیں کرنا چاہئے دوسرا نقصان پہنچا ہے ہمارے یہاں مغرب کی شاعری کی ہمہ گیر اثرات سے اب ترقی پسند شعرائے نے اس رویہ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ احتشام حسین صاحب ممتاز حسین ڈاکٹر محمد حسن نے عقیل رضوی نے بھی اس سلسلے میں جو لکھا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے ایک بات یہاں اور عرض کر دوں کہ ہم نے ایک بہت بڑا سیمینار کیا تھا اردو کا لوک ادب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا

ہے وہاں بھی آپ دیکھیں کہ ہم نے اپنی انھیں کمیوں اور کوتاہیوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ دنیا کی ہر شاعری میں ہندوستان کی ہر زبان میں لوک ادب کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اسکی بنیاد پر دراصل جو ہمارا شہری ادب Urbanise تھا جو کلاسیکی ادب ہے وہ وہاں تعمیر ہوا ہے لیکن اردو میں سرے سے اسے نظر انداز کیا گیا ہے اور اس کج روی کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ اسطرح کی جو مزاحمتی شاعری جس میں عوام کے دکھ درد ان کے جذبات احساسات کو بیان کیا جاتا ہے ان کو ہم نے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے تو ہم نے یہ کہا اور آج کچھ لوگوں کو ہم نے ابھی P.H.D کرایا۔ مغرب کی لوک شاعری پر اور بھی کچھ کام اس سلسلے میں کر رہے ہیں تو بہر حال ہمارے یہاں ایک کج روی اور کوتاہی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جوش کی شاعری کے ایک حصے کو بھی اسی طرح احتجاجی شاعری کہہ کر رد کیا گیا ہے۔ ترقی پسند شعرا سردار جعفری، کیفی اعظمی، نیاز حیدر اور سید مطلبی فرید آبادی بہت بڑے شاعر جو پاکستان آگئے تھے اور وہیں پر انکا انتقال ہوا۔ ان کی ساری شاعری لوک شاعری سے متاثر ہے۔ لیکن اسکو ہمارے نقادوں نے ترقی پسند نقادوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے ابھی تک ہمارے یہاں غزل زدگی کا جو جادو ہے چل رہا ہے۔

فاطمی:۔ عباس زیدی صاحب اس Agitational شاعری کے بارے میں جو ڈاکٹر صاحب نے ابھی ارشاد فرمایا آپ کچھ انگریزی کے حوالے سے بھی فرمانا چاہیں گے یا اردو کے حوالے سے بھی آپ کی کیا رائے ہے اس سلسلے میں؟

عباس زیدی:۔ بھئی میں چونکہ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں ادب کا آدمی نہیں ہوں۔ Scientist ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کے اندر پھر وہاں سے بات نکلتی ہے کہ ہماری جو South Asia کی روایت ہے اسمیں اگر ہم اپنی موسیقیت کو دیکھیں مثال کے طور پر موسیقی جو ہماری روایت ہے اور مغرب کی جو موسیقی روایت ہے اس سے Compare کریں تو ایک بڑا مزیدار اسکا پہلو ہے اور وہ یہ ہے مثال کے طور پر راگ درباری یا کوئی بھی راگ کو لے لیجئے اسکا جو Structure ہے وہ Fixed ہے اس Structure میں جب موسیقار بیٹھ کر اور گاتا ہے راگ درباری تو وہ اس وقت مانا جائے گا کہ جب تاثر تو اسکا سہی رہے کہ آپ کسی بھی دربار میں بیٹھیں لیکن ہر دفعہ جو وہ ایک نئی تان کھینچے تو اس میں جو Notes کا اسکا جو آپس میں تناسب ہو ترتیب ہو وہ ایسی

ہر دفعہ جو وہ ایک نئی تان کھینچے تو اس میں جو Notes کا اسکا جو آپس میں تناسب ہو ترتیب ہو وہ ایسی ہو کہ رنگ تو برقرار رہے لیکن ہر دفعہ آپ کے مزاج میں ایک دوسری کیفیت پیدا ہو ایک طرف تو وہ رنگ ٹوٹے بھی نہیں اور دوسری طرف ہر دفعہ جب وہ تان کھینچے تو اسمیں ایک نئی اُپج ہو تو میں جو جوش صاحب کی شاعری میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے Internalised کر لیا تھا اپنی اسی بات کو کہ جب وہ کسی چیز پر فکر کرتے تھے اسکو بیان کرتے تھے حالانکہ انکا پورا جو موضوع ہے وہ برقرار رہتا تھا لیکن وہ الفاظ جو تھے اس طریقے سے آپس میں جڑتے تھے کہ اسکے مختلف رنگ واضح ہونے لگتے تھے میں کافی اس پر غور کرتا ہوں بعض اوقات ان کے ایک لفظ کے اوپر کہ :۔

خیمۂ اورادو مناجات کی طرح
ہر گاہِ اساطیر حکایات کی طرح
پھر سن کی عقلِ بے مروّت کی ہوا
قندیل شبستانِ روایات کی طرح

اب آپ اسکے تناسب دیکھئے پھر سن کی عقلِ بے مروّت کی ہوا، ادھر خیمۂ اورادو مناجات کی طرح وغیرہ............یہ جو امیج میرے ذہن میں پیدا ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے بات تو صاف ہے کہ ہماری روایت ٹوٹ گئی لیکن ہر مصرع جو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک ایک لفظ اسکا وہ مختلف طریقے سے دکھائی دیتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے اوپر یہ جو الزام ہے کہ صاحب وہ الفاظ میں کھو جاتے ہیں مجھے تو ایسا نہیں لگتا خصوصاً ان کی رباعیات میں نہیں لگتا۔ جہاں تک انکے یہاں یہ ہے کہ دو طریقے سے ہم آپ کے دل پر اثر کر سکتے ہیں ایک تو یہ کہ میں رو کے آپ سے ایسے کہوں کہ آپ کا دل پسیج جائے اور ایک یہ کہ میں آپ سے ایسا کہوں کہ آپ کا دل دھڑکنے لگے میرے خیال سے جوش صاحب کا یہ انداز تھا کہ وہ رو کے نہیں کہتے تھے وہ کہتے تھے اس طرح کہ آپ کا دل دھڑکنے لگے اور اکثر لوگ ایسے ہیں جن کو یہ خواہش رہتی ہے کہ کوئی گا کے غزل ترنم کے ساتھ نزاکت سے ایسا کہے کہ میرا دل پسیج جائے ان کو میں پسند نہیں کرتا ان کا دل کھڑکتا ہی نہیں شاید بس میں یہی کہنا چاہتا تھا۔

قمر رئیس:۔ ایسے لوگوں کا نہ دل پسیجتا ہے نہ دھڑکتا ہے حالانکہ جوش کی شاعری کو دیکھیں تو وہ اکثر

دماغ کو دل کی طرح دھڑ کا دیتے ہیں۔اپنی بہترین فکر آمیز نظموں سے ....

فاطمی :۔میرا خیال ہے کہ انکی شاعری خلوت کی شاعری نہیں ہے وہ جلوت کی شاعری ہے اور یہ ایسے کچھ بری بات بھی نہیں ہے۔

اقبال حیدر :۔فاطمی صاحب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کو لے کر،لوک شاعری کے حوالے سے،ہمارے یہاں لوک شاعری کو لے کر ہمیشہ فرق کیا جاتا رہا ہے۔ جو لوک شاعری ہوتی تھی وہ تو پوربی اور مقامی زبانوں میں ہندی وغیرہ میں ہ اور جب شاعری ہونے لگتی تھی تب وہ اردو میں ہو جاتی تھی اس لئے اردو میں سرمایہ خاصہ رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اسکی طرف اپنی کتاب میں اشارہ بھی کیا تھا وہ ہیں اب مزاج بدل گیا غزل زدگی کے حوالے سے ابھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو میں کہا کہ صرف ترقی پسند جو نقاد تھے نام بھی لئے احتشام صاحب کا ممتاز صاحب کا،تو انھوں نے ان کے علاوہ کسی اور نے ترجیح نہ دی جب وہ Topic پر گفتگو کرنے پہ آتے ہیں ترقی پسند نقاد جو ہمارے معتبر نقاد ہیں تو اس Topic کے ساتھ پورا انصاف تو کرتے ہیں لیکن ان کے روّیوں میں تبدیلی اس سے نہیں آتی وہ انکے خون میں نہیں سرائیت کرتا............تو میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ کیونکہ آپ اس وقت آپ سے جو پیڑھی ہے اس کے آپ نمائندہ تنقید نگار ہیں،دانشور ہیں۔آپ اس سلسلے میں ترقی پسند خصوصاً ترقی پسند تحریک کے نقادوں کو کتنا مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ انھوں نے پہل ہی کی ۔ ہر چیز وہ کر لی جس سے ان کی ساکھ بنی رہے لیکن اصل مقصد پر آئے ہی نہیں یا یہ کہ اس حدف کو Hit کریں کہ یہ غلط ہو رہا ہے۔

فاطمی :۔ بیحد بنیادی سوال ہے اور بہت اچھا سوال ہے تھوڑا سا تنقید کی طرف ضرور چلا جاتا ہے اور ہم لوگ یہاں گفتگو کر رہے ہیں ۔ جوش کو لیکر دیکھئے یہ سوال تنقید سے متعلق ہے اور اس سوال کا جواب جتنا بہتر طور پر ہمارے قمر رئیس صاحب دے سکتے ہیں میں شاید نہیں دے سکتا لیکن چونکہ آپ نے مجھی سے مخاطب کر کے سوال کیا ہے تو میرا یہ اپنا ماننا ہے کہ آپ نے جو بھی ابھی نام لئے ہیں احتشام حسین،ممتاز حسین،محمد حسن وغیرہ میں انکی علمیت پر شک نہیں کرتا۔انھوں نے مارکسزم کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور اسکا اطلاق بڑے ایماندارانہ طور پر ادب کے تعلق سے کیا ہے اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دیکھئے سو سال گزر گئے اور نظیر اکبر آبادی کو نوٹس نہیں لیا گیا ایک شیفتہ کا جملہ کہ

''بازاری شاعر ہے'' اور اس کو نظر انداز کر دیا گیا ''نگار'' کا پہلی مرتبہ جب ۱۹۴۰ء میں نظیر نمبر آتا ہے تو نظیر کو اچانک روشناس کرانے والے جو لوگ تھے وہ ترقی پسند نقاد ہی تھے۔ احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری صاحب، آل احمد سرور وغیرہ وغیرہ تو یہ سب تھے اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور اسکی زمینی اور ثقافتی اقدار کو تاریخی اور تہذیبی اقدار کو جس طرح پہلی مرتبہ ترقی پسندوں نے پیش کیا تنقید کی بات ہو رہی ہے جو تنقیدی مضامین یعنی بہت سارے شعرا کو اس کے پورے تاریخ، تہذیب اور ثقافت اور عوامی تہذیب کے تناظر میں پیش کرنے کا جو ایک مارکسی عمل ہمارے ترقی پسند نقادوں نے کیا وہ اس سے پہلے نہیں تھا اس لئے تنقید کا دائرہ ہی نہیں بڑھا بلکہ اس کا معیار اور وقار بھی بڑھا اسمیں کوئی شک نہیں ہے لیکن اب اسکا کیا کیجئے کہ یہ جتنے نقاد تھے ان میں سے بیشتر ایک مخصوص تہذیبی پس منظر سے آئے تھے اس لئے آپ ان سے یہ توقع کریں کہ یہ بھی اس طرح سے مارکسی ہو جائیں اور کدال اور پھاوڑا لیکر کھیت میں آجائیں۔ میدان میں آجائیں یہ ذرا مشکل کام ہے اور اچانک اس تہذیبی تضاد تصادم، سے جرأت مندانہ طور پر نبرد آزما ہونا ہمارے خیال سے ایک مشکل کام ہوتا ہے نقاد بھی ایک انسان ہوتا ہے ایک خاص Class سے آتا ہے اس کی ایک خاص بچپن سے ایک نفسیات بنی ہوتی ہے۔ اس نفسیات کے دائرے سے نکل آنا آسان نہیں جوش نہیں نکل پاتے۔ اپنی تمام طرح کی ہمدردیوں کے باوجود جوش نہیں نکل پائے اب دیکھئے کہ کسان پر وہ نظم تو کہتے ہیں لیکن اس نظم کی Diction بھی دیکھ لیجئے ایک عام آدمی ہم کہتے ہیں کہ ایک طالب علم اسے صحیح پڑھ نہیں سکتا بعض استاد بھی.........

قمر رئیس: ۔گرمی اور دیہاتی بازار، آبشار وغیرہ میں تو ہے۔

فاطمی: ۔ کچھ نظموں میں ضرور ہے۔ میں نے ایک بار سردار جعفری سے یہ سوال کیا کہ کسان جو نظم جوش نے کہی ہے تو یہ کسان تو کیا عام آدمی بھی نہیں سمجھ سکتا تو انھوں نے جواب دیا کہ بھئی یہ کسان کے لئے نہیں کہی گئی کسان پر ایک نظم کہی ہے اور اپنے ڈھنگ سے کہہ دی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ Folk Poetry کے بھی اپنے ایک مدارج ہیں کہ آپ موضوع لے لیتے ہیں اور اپنے ڈھنگ سے بات کہتے ہیں اور دوسرا راستہ وہ ہے کہ موضوع بھی لیتے ہیں اور لہجہ بھی وہی لیتے ہیں عوامی folk Poetry والا ان سب چیزوں کی وجہ سے ہمارے یہاں تنقید میں کچھ گڑبڑیاں بھی ہوئیں اور یہ صحیح

ہے کہ ہوکریسی بھی کہیں نہ کہیں.......

اقبال حیدر:۔ کہیں کہیں ہوتی تو ہمیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔

فاطمی:۔آپ کے خیال میں زیادہ ہے۔بہر حال اس کثرت کا جواب تو ڈاکٹر صاحب ہی دیں گے۔

اقبال حیدر:۔میرے خیال میں ہم جیسے لوگوں کے لئے پریشانی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ہم لوگ آپ لوگوں کی طرح پروفیشنل ادیب یا ناقد نہیں اس لئے جب گڑبڑی ہوتی ہے تو پریشانی ہوتی ہے۔

فاطمی:۔دیکھئے یہ تنقید کی لمبی بحث ہے۔تنقید کا معاملہ بھی عجیب وغریب ہے۔مارکس کا بھی جو تصور ادب ہے وہ اسکے تصورِ اقتصادیات مارکسیات سے قدرے مختلف ہے خود مارکس نے بھی کئی مرتبہ کہا ہے کہ فن پر، زبان پر بہت توجہ دی ہے کہا ہے ادب فن ہے تو ہمارے ترقی پسند نقادوں نے بھی مارکسزم کے اس پہلو کو سمجھا اور اسکو اسی طرح پیش کیا لیکن وہ وہی ہے کہ ہم اپنی Class کی جو سائیکی ہوتی ہے مثلاً سجاد ظہیر لیکن سجاد ظہیر exceptional ہیں لیکن بہت سارے دوسرے نقاد ہیں بہر حال یہ بیحد اہم سوالات ہیں اس پر پھر کبھی گفتگو کریں گے اب میں آخری سوال کرتا ہوں جو بڑا افنکار ہوتا ہے وہ قوم،نسل،سرحد اور جغرفیے سے بلند ہوتا ہے اور اسکا اصل پیغام ساری انسانیت کے لئے ہوتا ہے تو کیا جوش کی شاعری ایسی ہے جو پورے عالمِ انسانیت کو پیغام دیتی ہے اسی آخری سوال پر ہم چاہیں گے کہ تھوڑا سا آپ اور آخر میں ڈاکٹر صاحب اظہارِ خیال کریں آپ جوش کو عالمِ انسانیت کے حوالے سے کہاں دیکھتے ہیں جسمیں آج کا عہد بھی شاملِ ہے۔

اقبال حیدر: پہلے تو میں یہی کہوں گا کہ میں جوش کو دیکھتا ہی ہوں کہ جوش تو تھے ہی عالمِ انسانیت کے لئے جوش کا اور کوئی قبیلہ تھا ہی نہیں اور ہر پرویڈی سے باہر تھے اور ہر چیز میں شامل تھے اس لحاظ سے تو اب Syllabus کے point پر اگر آپ دیکھیں تو اس وقت جو چیزیں فرض کریں پوری دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے ہر طرح کی قتل وغارت گری تشدد پسندی انکے دو یا ایک بنیادی گوشہ اگر آپ ڈھونڈنا چاہیں وہ کیا ہیں ہر آدمی اس بات پر مُصر ہے میرے نزدیک کیونکہ یہ تو مجھے پتہ ہی ہے کہ میرے ابا میاں کا جو خدا ہے وہ بہت اچھا پیارا پیارا ہے اور اسکی Culture اور اسکی تہذیب بہت اچھی ہے آپ لوگ اسی پر کیوں نہیں آجاتے۔بنیادی جذبہ جو محرکِ اوّل بنتا ہے نہ وہ یہ ہے کہ آپ نے یہ سمجھ لیا کہ میری Position تو اچھی ہے باقی سب کچھ

Position میں by in کرنی چاہئے جبکہ یہ اسکے بالکل برعکس ہے جبکہ کرنا یہ چاہیئے کہ سب کہیں کہ بھئی Loosly سب آدمی Partially Right ہیں اور Partially wrong بھی تو ہمیں اس کو English میں جو کہتے ہیں Less window تو بھئی کلام کرو دخل دو اور دیکھو کہ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچے ہیں یہی چیز مذہب اور مارکسزم اور ہر ازم کے حوالے سے اگر آپ نے جامد کر لیا کہ وہ اقبال کا ہے شعر نہ کہ........

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

وہ اتنا بھرپور تبصرہ ہے ہر چیز پہ تو اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو جوش کی Relevznce آج یا اس کے قبل کسی بھی آدمی کو جو بانٹ نہیں رہا ہے جوڑ رہا ہے اسکی Relevance جو ہے وہ ازلی ہوتی ہے اسکی نہ کوئی Time limit ہے جس طرح زندگی جس کا ہمیں نہیں پتہ کہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی اس طرح اس Relevance کا تعلق ہے تو جوش اس لحاظ سے بہت ہی Relevent ہیں کہ زندگی کی جو مکمل حقیقت ہے مذہب کی، خدا کی جو Absolute حقیقت ہے ہر چیز کی Relevent حقیقت ہے جو بھی Absolute Values ہیں اس میں جوش کا Role بہت ہی متحرک اور بہت ہی Powerfull ہے تو اسلئے جوش کی Relevance جو ہے اور ہم سب سے زیادہ اسی کے قائل ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہر وقت زندگی جو ہے تجاوز کرتی ہے ابھی جو تنقید نگاروں کی گفتگو ہوئی تھی اسمیں بھی یہی چیز تھی کہ اگر آپ جم کر کھڑے ہو گئے چاہے وہ مارکسزم ہی کیوں نہ ہو تو پھر آپ جم گئے آپ چل نہیں رہے یہ چلتے رہنا جو ہے شرطِ اوّل ہے اور جوش ایسے آدمی ہیں ایک آدمی اور ہے اردو شاعری میں وہ ہے غالبؔ جو مستقل فکری حوالے سے چل رہے ہیں رُکتے نہیں ہیں چل رہے ہیں غلط سمت میں جا سکتے ہیں مڑ کے آئیں گے پھر چلنے لگیں گے......لیکن یہ نہیں کہ جس راہ پر چل پڑے ہیں تو اب چلتے رہیں یہ جو چیز ہے جوش کی Relevance اسکو آپ اٹھا کر آج کے دور میں دیکھیں کہ اگر صرف یہی چیز ٹھیک کر لی جائے تو کسی حد تک اور چلئے دنیا میں تو آپ بعد میں جائیں گے پہلے اپنے معاشرت میں جا کر دیکھیں کہ ہر آدمی اڑا ہوا ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ زندگی جس چیز سے آگے بڑھتی ہے وہ ہے Human Interaction اور اس کا فقدان ہے ہماری شاعری میں اگر آپ نظیر، جوش اس قبیل کے شاعروں کو

ہٹا دیں تو نقدان ہے بالکل کیونکہ ہم انکو Interact کرتے ہی نہیں ہم تو کمرے میں بیٹھ کر سوچ لیتے ہیں دربار میں جا کر پیش کر دیتے ہیں تو اب آپ اسکو دیکھیں تو خود ہی Relevence آپ کے سمجھ میں آجائے گی۔

عباس زیدی:۔صحیح کہا ہے اقبال حیدر نے آج کل کے جو مسائل ہیں اس پر اتفاق ہے مفکرین میں کہ اسکا Solution جو ہے وہ Diversity ہے نئے Culture نے ہمارے معاشرے کو اور ہمارے ماحول کو تباہ کر دیا ہے اور یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ جو بھی سوچنے والے ہیں چاہے وہ سائنس داں ہوں ، Artist ہوں انکا سب کا یہ خیال ہے کہ Diversity خالی ہمیں Safe کر سکتی ہے۔ stability Create کر سکتی ہے صرف Diversity اس لحاظ سے مشکل یہ ہو جاتی ہے کہ اگر آپ اس چیز کا پرچار کرتے ہیں تو آپ کا کوئی قبیلہ نہیں ہوتا اور جب قبیلہ نہیں ہوتا لہٰذا آپ کا کوئی علم اٹھا کے مشتہر نہیں کرتا یہ مشکل ہے جوش صاحب کے ساتھ۔

فاطمی:۔ڈاکٹر صاحب آخیر میں آپ سے گفتگو کرنا چاہوں گا جہاں سے آپ نے گفتگو شروع کی تھی میں چاہتا ہوں کہ وہاں لاکر کے میں گفتگو ختم کر دوں کہ آج کے اس عالمی تناظر یا عالمی مسائل میں جیسا کہ اشارہ ہمارے دوستوں نے کیا نئے سرے سے جوش کو Rediscover یا Re Stablish کرنے کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔اس پر ہم چاہتے ہیں کہ گفتگو ختم کریں۔

قمر رئیس:۔دیکھئے ابھی اقبال حیدر صاحب، اور زیدی صاحب نے جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی بنیادی باتیں ہیں اور وہ ہمیں Conclude کرنے کی طرف لے جاتی ہیں کہ جوش کے یہاں بکھراؤ بھی بہت ہے یہ انتشار ذہنی بھی ہے جذباتی بھی ہے اور فکری بھی ہے اس بات کو ہم لوگ مان کر چل رہے ہیں اور ہر سوچنے والے بڑے شاعر کے یہاں اسطرح کے بکھراؤ ہوتے ہی ہیں اور اسی بکھراؤ میں سے ایسی باتیں ابھرتی ہیں فکری سطح پر بھی جن میں Integration ہوتا ہے لیکن وہ کدھر لے جاتی ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اقبال حیدر صاحب نے کہا کہ بنیادی طور پر جوش کی شاعری میں جو چیزیں ابھر کر آتی ہیں اس کو انھوں نے Absolute اقدار کا نام دیا ہے جنہیں ہم کہیں گے مطلق اقدار، میں ان کو یہ نام تو نہیں دیتا اور اسلئے کہ اس میں تھوڑا سا اشتباہ اور چیزوں کا آجاتا ہے یہ کیا ایک طرح کے مطلق اقدار ہیں یا نہیں ہم مارکسٹ لوگ اسکو اس طرح سے نہیں لیتے ہم سمجھتے ہیں

کہ وہ بنیادی انسانی اقدار ہیں جو ہر مذہب، ہر مروّجہ اخلاقی نظام ہر طرح کے سیاسی نظام سے بلند اور ماوراء ہوتی ہیں اور جب شاعر ادیب تخلیق کار کے سامنے یہ سوال آتا ہے تو ان تمام نظاموں سے جو اسکو ورثے میں ملتے ہین دین بزرگاں سے تو وہ انحراف کرتا ہی ہے کہ اپنے دور کے نظام سے اپنے دور کے اقدار سے بھی وہ انحراف کرتا ہے اور یہ انحراف کبھی بغاوت کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے اور پھر اپنی سچائیاں اپنے دور کے حوالے سے وہ دریافت کرتا ہے اسی میں اسکی معنویت پنہاں ہوتی ہے اور جتنی بلندی تک وہ بنی نوع انسان سے اپنی ہمدردی، دردمندی اور اسی کے ساتھ ساتھ احساس اور ادراک کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ اسکی شاعری میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے بلندی پیدا ہوتی ہے اسی لئے ہم نے دیکھا ہے کہ ترقی پسند شعرائیں بھی ایک دو کو چھوڑ کر وہ ایک خاص سطح سے اوپر جا نہیں سکے اب وہ جو پیغام والی بات ابھی دہرائی گئی ہے وہ شاید اقبال حیدر صاحب نے کہی تھی میں سمجھتا ہوں کہ بنی نوع انسان سے دردمندی اور ہمدردی کا رشتہ اسکو جن انسانی قدروں کی طرف لے جاتا ہے وہی پیغام ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں آپ دیکھیں گے جو پیغام ملتا ہے اگر اسکو واضح سطح پر لے جائیں تو وہ ادھر نہیں لے جاتا لیکن اقبال کی شاعری میں یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ بنی نوع انسان سارے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں آخیر دور کی وہ نظمیں یا وہ پیغام جسکو انھوں نے ریڈیو کے لئے دیا تھا مرنے سے پہلے بالکل واضح دوٹوک الفاظ میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ تمام انسان چاہے وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں سب وحدت کے ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اسی طرح ٹیگور کا بھی جو پیغام ہے وہ بھی کوئی فلسفیانہ، مربوط، منظّم پیغام انکے یہاں نہیں ملتا تو یہ پیغام ہمیں جوش کے یہاں بھی ملتا ہے اور بہت واضح اور صاف روشن طریقے سے ملتا ہے۔ صرف اسکو سلیقہ سے پیش کرنے کی ضرورت ہے اسکو سمجھنے کی ضرورت ہے جسکو ابھی تک شاید ہم نہیں کر سکے ہیں اور اسکے برعکس ہمارے یہاں جس طرح کی قوتیں کارفرما رہی ہیں اس پر ہم شاید بعد میں گفتگو کریں گے کہ جوش کے خلاف جو مخاصمانہ اور معاندانہ تنقید ہوئی ہے اسکے اسباب کیا تھے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ فاطمی صاحب ہمیں اسکو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس میں کچھ سچائیاں بھی تھیں میں ذاتی طور پر آپ کو بتادوں کہ میرے اندر خود جوش کے خلاف ایک تعصب رہا ہے خاص طور سے انکے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد میں اور میری طرح کے دوسرے لوگ۔ جو اس زمانے میں تھے وہ اس

سے اندر اندر بہت برہم ہوئے بہت ناراض ہوئے اور ایک دکھ بھی ہوا اور درد بھی ہوا لیکن آہستہ آہستہ پھر ہم پر ہمارا جو ادبی ورثہ اور فنی شعور ہے اس نے غلبہ حاصل کیا اور خاص طور سے اقبال حیدر صاحب کے رشتے سے جب ہم ملے بیس بائیس سال پہلے اور انھوں نے جوش کی معنویت اور اہمیت کو جتایا اور بتایا تو ہم نے از سرِ نو جوش کو پڑھنے کی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اپنے احباب اور دوستوں کو بھی جوش کی طرف متوجہ کیا ہے جیسے فاطمی صاحب نے کیا ہے ان کی نگرانی میں کئی طلباء ہیں جو جوش پر سنجیدگی کے ساتھ کام کر رہے ہیں تو ایک فضا بنی ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ آج کا یہ ہمارا جو مذاکرہ ہے ایک نئی تمہید کے طور پر ایک نئے تعارف کے طور پر اس تحریک کی طرف لے جا رہا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ایک Discourse قائم ہو۔ جوش کے حوالے سے اور آزادانہ طور پر، بے باکانہ طور پر اور نہایت معروضی انداز سے جوش کو سمجھنے کی کوشش کریں لیکن لوگوں کو متوجہ ضرور کریں کہ آپ جوش کے خلاف لکھئے لیکن پڑھئے جوش کو۔ جوش کو پڑھا جائے پھر آپ اپنے طور پر آج کے دور کی جو سچائیاں ہیں انکے حوالے سے جوش کو دریافت کیجئے تلاش کیجئے اور اسکو سمجھئے اور یہ بتایئے کی جس طرح غالب کی روایت ہے، میر کی روایت ہے، اقبال کی روایت ہے۔ جوش کی روایت آج کی شاعری کو آج کی انسانیت کو کہاں لے جاتی ہے مجھے اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ آج دنیا کے جو حالات ہیں جس کی طرف آپ لوگوں نے خاص طور پر اقبال حیدر نے اشارہ کیا ہے مثال کے طور پر Fundamentalism کسی بھی شکل میں کہیئے بہت بری طرح سے پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ خاص طور سے برِصغیر ہندوستان اور پاکستان میں اور اسی طرح Central Asia میں آپ دیکھئے میں برابر جا رہا ہوں۔ آپ دیکھئے وہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔ اسمیں جوش کہاں ٹھہرتے ہیں کیا جوش نے بہت منضبط طریقے سے نہایت شدت کے ساتھ ان رجحانات کی مذمت نہیں کی۔ اس طرح آپ دیکھیں بے شک امریکی معاشرہ ایسا ہے کہ جس سے ہم متاثر ہوئے ہیں لیکن امریکی حکومت کے جو سامراجی مقاصد اور رویے ہیں اور جس طرح سے وہ مشرقی اقوام پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے ایسے میں جوش کہاں کھڑے ہیں جوش نے کیا پورے سامراج کے استحصالی مقصد پر حملے نہیں کیے ہیں۔ ان کی وہ نظمیں یاد کیجئے بے شک انھوں نے اس زمانے کے عصری حوالوں سے کہی جو British کے خلاف تھی ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' اس طرح کی اور تو کیا آج

وہ Relevant نہیں ہیں ۔ وہ بھی ہیں انکا جو اسلوب ہے اسی طرح کا اور آپ دیکھیں جو اس طرف میں جا نہیں رہا ہوں لیکن آگے چلکر جب ہم تفصیلات میں آئیں گے ہندوستان میں انھوں نے ایک جگہ ابھی میں کل ہی پڑھ رہا تھا اس پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور صرف تصور رہے گا جب تک کہ ہندو مسلمان کے درمیان ازدواجی رشتے قائم نہ ہوں ۔ یہ انقلابی بیان تھا ان کا اور آج ہم لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ہندو مسلمان کے درمیان قربت کے بجائے ایک طرح کی دوری پیدا ہو رہی ہے ۔ خاص طور سے گجرات اور اس طرح کے واقعات آپ لوگ جانتے ہیں ہزاروں فسادات ہوئے ہیں ۔ ہندوستان میں تو آپ دیکھیں کہ شعر و ادب کی طرف اگر ہم آئیں تو وہ ایک الگ میدان تھا کہ آج یہ کہا جاتا ہے کہ جوش کی شاعری Loud ہے اس میں تشبیہات کی کثرت ہے اس میں ایک بیانیہ انداز ہے جو آدمی کو جذباتی طور پر بہا تو لے جاتا ہے لیکن وہ اعلیٰ شعری اقدار کے تحت ہمارے اندر دیرپا تاثر شعر و ادب پیدا نہیں ہوتا ۔ اسمیں سچائی ہے لیکن اسکے باوجود آپ دیکھیں کہ جدیدیت کی تحریک کے زیرِ اثر شاعری کو ایک طرح سے معمہ کاری بنانے کی جو کوشش کی گئی تھی استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ سے وہ دور ختم ہو چکا اور اسکے خلاف ایک بھرپور بغاوت بھی ہوئی ۔ آج جو مابعد جدیدیت کے نام پر تحریک شروع ہوئی ہے اسمیں ان ہی اوصاف و اقدار کو زندہ کیا جا رہا ہے جو ترقی پسندوں اور جوش جیسے شاعروں نے پیش کی تھی ۔ اسمیں کیا جوش کی معنویت یا اہمیت کم ہے اور جوش کی لفظیات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جو سمندر تھا آج ہمارے جو شاعر ہیں ان کے یہاں اسکا پچاس واں حصہ بھی نہیں ہے کیا شعری زبان و بیان پر قابو پائے بغیر جس طرح جوش نے کیا ہے اعلیٰ درجہ کی شاعری، گہری شاعری، دیرپا شاعری، کی جاسکتی ہے اسی طرح اسلوب کے اعتبار سے بھی جوش کے یہاں جس طرح کا تنوع ہے تہ داری ہے سب نظموں میں نہیں بے شمار نظموں میں جو ملتی ہے جو نئی نئی Dimensions وہ تلاش کرتے ہیں اظہار و بیان کی آج کی شاعری میں ہمیں کہیں وہ ملتی ہے؟ نہیں ملتی! ہمیں پھر جوش کے ہی طرف جانا پڑے گا تو اسلئے ہم سمجھتے ہیں یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار پہلو ہیں جوش شناسی کے، جوش کی شاعری کے جو آج ہمیں بلا رہے ہیں ۔ ہمیں دعوت دے رہے ہیں کہ بھئی ہماری طرف بڑھو ہمیں ڈھونڈو ہم کچھ لیں گے نہیں دیں گے ۔ شاعروں کو بھی دیں گے ادب کو بھی دیں گے اور اردو شاعری کے اس کارواں کو بھی دیں گے جو بڑی سُست

روی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

فاطمی: ۔ بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب ...... آپ نے بہت اچھے طریقے سے اپنی باتیں رکھیں اور آپ سب کا بھی شکریہ کہ آپ نے جوشؔ کے حوالے سے فکر وخیال کی نئی راہیں کھولیں ۔ مجھے یقین ہے کہ آج کا یہ مذاکرہ یہ آج کی گفتگو ہمارے قارئین کو بھی سوچنے پر مجبور کرے گی اور جوشؔ کو ازسرِ نو سمجھنے کا مواقع فراہم کرے گی ۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔

☆☆☆

سوال و جواب

''ادب کے شائقین، قارئین و ناقدین کو بزمِ جوش میں شامل کرنے کی اور مختلف ناقدین و دانشوران کی آراء کو پیش کرنے کی غرض سے ایک سوالنامہ تیار کیا گیا اور متعدد معززین کو روانہ کیا گیا۔ جن میں سے پانچ کے جوابات حاضرِ خدمت ہیں۔''

مرتبین

سوالات

(۱) کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش سب سے ممتاز اور قد آور شاعر ہیں؟

(۲) کیا جوش کی شاعری محض کثرتِ الفاظ کی شاعری ہے۔ آج شاعری کی جو صورتِ حال ہے۔ لفظیات کی کمی، اسلوب کی کمزوری، غیر متاثر کن لب و لہجہ وغیرہ ایسے میں جوش کی شاعری کی یاد نہیں آتی۔ کیا بغیر تنوع و تہہ داری کے اچھی شاعری ممکن ہے؟

(۳) کیا غزل کی روایتی شعریات کے پیمانے پر جوش کی نظمیہ شاعری کو مناسب طور پر پرکھا جا سکتا ہے اور اس کو صحیح مقام دیا جا سکتا ہے ؟

(۴) کیا آج سودا، نظیر، انیس وغیرہ کی شعری روایت کو جوش کی شاعری میں از سرِ نو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟

(۵) آج دنیا اپنی اپنی ذات، مذہب اور علاقہ میں سکڑتی جا رہی ہے ایسے میں جوش کی شاعری کی وسعت رنگارنگی اور ہمہ جہتی کو آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں ؟

(۶) آج دنیا میں جو آویزش تشدد اور کشمکش کے حالات ہیں اس کے تناظر میں آپ جوش کی شاعری میں کس طرح کی معنویت پاتے ہیں ؟

(۷) جوش کی شاعری میں کوئی مربوط فکر و فلسفہ نہیں۔ اس کے باوجود حیات و کائنات

فطرت استحصال پر مبنی معاشرہ اور بنی نوع انسان کے مقدر کے بارے میں وہ ایک منفرد فکر ونظر کے مالک تھے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

(۸) جوش کی شاعری بے شک کچھ کمزور پہلو رکھتی ہے۔جن کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن ان کی شاعری کے جومثبت پہلو اور منفرد اوصاف وعناصر ہیں ان کی تفصیل علمی ڈھنگ سے سامنے نہیں آئی ہے،آپ کی رائے کیا ہے ؟

(۹) جوش کی ہجرت ایک ایسا سانحہ ہے جس نے ان کی شہرت کوتو نقصان پہنچایا ہی لیکن کیا آپ کی رائے میں ہندو پاکستان میں ان کی شاعری کے مطالعہ اور تحقیق سے جو بے نیازی برتی گئی اس سے خود اردو شاعری کونقصان نہیں پہنچا؟

(۱۰) کیا آپ سمجھتے ہیں جوش کی شخصیت اور شاعری کے سرمایہ کو از سرِ نو دریافت کرنے کی ضرورت ہے ؟

جوابات

مظہر امام

(۱) یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ''اقبالؔ کے بعد جوشؔ سب سے ممتاز اور قد آور شاعر ہیں۔''لیکن جوش بلاشبہ ایک نہایت ممتاز اور قد آور شاعر ہیں۔اقبالؔ کے بعد کے شاعروں میں فیضؔ،راشد،میرا جی اور اختر الایمان جوشؔ کی صف میں رکھے جاسکتے ہیں۔

(۲) صرف ''کثرت الفاظ'' سے اعلیٰ شاعری وجود میں نہیں آتی،لیکن ''قلت الفاظ'' بھی شاعر کے عجز کی علامت ہے۔آج کی عمومی شاعری لفظیات،اسلوب اور لب ولہجہ کے اعتبار سے غیر متاثر کن ہے۔مشق سخن کے طور پر،اور شاعری کے ضروری لوازمات کی آگاہی کے لئے جوش کا مطالعہ یقیناً مفید ہوسکتا ہے۔

(۳) جوش نے غزلیں بھی کہی ہیں،لیکن وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں خیالات کا وفور ہے،الفاظ کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔وہ تفصیل اور اطناب کے شاعر ہیں۔اس لئے غزل کی روایتی شعریات کے پیمانے پر جوش کی نظمیہ شاعری کو پرکھنا ایک

غیرادبی اور غیر تنقیدی عمل ہوگا۔

(۴) جوش بلاشبہ سودا، نظیر اور انیس کی روایت کے شاعر ہیں۔اور میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر انیس نہ ہوتے تو شاید جوش بھی نہ ہوتے۔

(۵) جوش ایک وسیع النظر اور وسیع المشرب شاعر ہیں۔انہیں کسی طرح محدود نہیں کیا جاسکتا۔آج ہماری فکر کا دائرہ جس طرح سکڑتا سمٹتا جارہا ہے اور تعصب اور تنگ نظری نے ہمارے سماج کو جس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے،اس صورت حال میں جوش کی شاعری زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

(۶) جوش آزادی اور انقلاب کے شاعر ہیں۔امن،انصاف اور مساوات کے شاعر ہیں۔جو عالمی امن کا ہمنوا ہو، وہ آویزش، تشدد اور کشمکش کے پروردہ حالات سے کیسے ذہنی مطابقت پیدا کرسکتا ہے۔اس لئے میں سمجھتا ہوں، جوش کی شاعری کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

(۷) یہ صحیح ہے کہ جوش کی شاعری میں اقبال کی طرح کوئی مربوط فکر و فلسفہ نہیں۔ غالب کی شاعری میں کب ہے! لیکن حیات و کائنات کے مظاہر اور نوع انسان کے گوناگوں مسائل کے تعلق سے، جوش نے اپنی شاعری میں جو دردمندانہ اشارے کئے ہیں،ان سے جوش کی فکر و نظر کی صلابت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۸) جوش کی شاعری بیانیہ شاعری ہے۔انیس اور حالی کی شاعری بھی بیانیہ ہے۔ آج کی تنقید ایسی شاعری کو مطعون کرتی ہے جس میں واشگاف انداز میں کوئی بات کہی گئی ہو۔ کسان اور مزدور کے تعلق سے کہی ہوئی شاعری گردن زدنی ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے موضوعات پر رسمی شاعری بہت ہوئی ہے۔لیکن جوش کی نظم ''کسان'' اس منظر کشی سے شروع ہوتی ہے،جس کے شاعرانہ حُسن سے انکار ایمان داری کے منافی ہے۔

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ

دور دریا کے کنارے، دھند لے دھند لے سے چراغ

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود

مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود

یہ صحیح ہے کہ جوش کی شاعری کا حقیقت پسندانہ محاکمہ مناسب طور پر نہیں کیا گیا ہے۔

(۹) ہندوستان کے قیام کے دوران ہی جوش کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں شکوک کا اظہار ہونے لگا تھا۔ پاکستان جانے کے بعد ان کی شاعری جاں کنی میں گرفتار ہوگئی۔ ان کی پاکستان کی ہجرت نے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں ایک زلزلہ سا پیدا کر دیا۔ انہوں نے پاکستان جاکر ''یادوں کی برات'' کی نام سے آپ بیتی لکھی۔ کہا گیا کہ اس میں جھوٹ کا پلڑا بھاری ہے۔ ریستورانوں کی ادبی گپ بازی'' کے دوران سنا گیا کہ فیض اور حفیظ جالندھری ان کے زبردست مخالف ہیں۔ اشارہ علاقائی اختلاف کی طرف تھا۔

یہ باتیں جوش کی ذاتی زندگی یا ذاتیات سے متعلق ہیں۔ ان کی شاعری کو اس ذاتی تناظر سے الگ کر کے ان کا صحیح تنقیدی محاسبہ، Appreciation اور Evaluation ہونا چاہئے تھا، مگر جوش کی شاعری سے برابر بے توجہی برتی گئی۔ اب ان کے ایک درجن سے زاید مجموعوں میں سے شاید ہی کوئی مجموعہ بازار میں دستیاب ہو۔ البتہ ان کی متنازعہ فیہ خود نوشت ''یادوں کی برات'' کو اب بھی پذیرائی حاصل ہے۔ ان کے حقیقی یا فرضی معاشقوں کا حال لوگ مزے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اسے مطعون کرتے ہیں۔

جوش کی شاعری سے اغماض برتنا خود آج کی شعر فہمی پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ کیوں کہ ہکلاتی ہوئی، ناموزوں، فنی لوازمات سے عاری، بے معنی، بے رس شاعری کی تعریف میں لوگ رطب اللسان ہیں، اور ایسے شاعروں پر ''قادرالکلامی'' کی تہمت لگائی جا رہی ہے۔

(۱۰) جوش کی شخصیت کو اپنے زمانے کے تناظر میں دیکھنے اور ان کی شاعری کو وقت کے تقاضوں سے مربوط کر کے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کا ایک عمدہ انتخاب ضرور شائع ہو جانا چاہئے، اور یہ انتخاب کم از کم تین اہل نظر کریں، رسمی طور پر نہیں، بلکہ واقعی غور و فکر کے بعد۔

سید محمد عقیل

(۱) جناب! میرے اتفاق کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے کہ جوشؔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ واقعی جوشؔ کے کیا کارنامے ہیں جو لوگوں کو، اس خیال کی طرف لے جاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں۔ اگر چہ ایسے لوگ بھی ہیں جو مانتے ہیں کہ جوشؔ بڑے شاعر تو کیا وہ ایک بے حد معمولی اور تقریباً بچکانے شاعر ہیں۔ مگر خیر وہ یقیناً اقبالؔ ایک بے حد قد آور شاعر ہیں جن کا مثل بیسویں صدی میں کوئی نہیں۔ مگر جوشؔ نے ادب اور سیاست کا جو سرا تھاما وہ اگر چہ اقبالؔ ہی کی طریقِ فکر اور طریق شاعری سے نکلا مگر انھوں نے اُس کو اپنے زمانے کے رنگ و آہنگ اور فکر کے اُن اطراف سے لیا جو اقبالؔ سے تقریباً چھوٹ گئے تھے یا اُن کا مسئلہ اس وقت تک نہیں بنے تھے اور پایانِ کار انھیں جوشؔ نے اپنی شعری خوش سلیقگی سے ایک ایسی بلندی تک پہنچایا جو جوشؔ کے ہم عصروں میں سے کسی اور سے ممکن نہ ہوسکا (ان ہم عصروں میں اقبالؔ شامل نہیں) یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ اردو شاعری کیا شاید فارسی شاعری میں بھی انقلاب کا لفظ سب سے پہلے اقبالؔ ہی نے استعمال کیا جو سیاسی انقلاب سے پھوٹا مگر اس کی توسیع، ممکنات، پینتروں اور اقدام کو صرف جوشؔ نے عوام سے متعارف کرایا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ (انقلاب) اقبالؔ کے یہاں ایک فلسفہ ءفکر تھا جسے جوش نے عمل کی طرف اور ایک طرح سے اُسے ایک Applied تحرک دیا۔ اس طرح کہ وہ ہندوستانی سیاست اور عوام کے لئے نہ صرف CONVINCING بلکہ باخبری اور اقدام کا زینہ بن گئے۔ رواں دواں اور لمحاتی سیاست بھی دور رس انجاموں کی طرف انسانوں اور جمہور کو لے جاتی ہے جسے تحقیر کی نظر سے دیکھنا بے خبروں کا پردہ کھولتا ہے۔ لیکن جب یہ کوشش کامیاب ہو کر کار آمد بن جاتی ہے تو یہ منکر اس کے زُلۂ رُبا بن جاتے ہیں۔ جوشؔ کی ان تمام سیاسی نظموں کو جنھیں میں اقبال کا اگلا قدم سمجھتا ہوں۔ ایسے معترضین کو پھر ٹھنڈے دل سے ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ یقیناً جوشؔ، اقبالؔ کی طرح اپنے کینوس کو عالمی بساط تک لے کر نہیں چل سکتے تھے۔ شاید اُن کی نظر اقبالؔ کی طرح عالمی سیاست پر تھی بھی نہیں۔ نہ عالمی سیاست ان کی گرفت میں تھی اور نہ انھوں نے کبھی دعویٰ کیا۔ مگر ہندوستان کی لمحاتی سیاست میں جو، گرفت

جوشؔ کو حاصل ہوئی ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے ۔ ''شکستِ زنداں کا خواب'' حیف اے ہندوستاں''
ماتمِ آزادی، غدّار سے خطاب، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے جیسی نظموں سے

مری حکمت بشر کو دعوتِ نو دے کے دم لے گی
میں اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر کے چھوڑوں گا

تک جیسی نظمیں اور باتیں، شاید اقبالؔ کی فکر کا محور اور اظہار (Exposition) نہ بن پائیں کیونکہ اقبال سیاسی فلسفے کے شاعر تھے اور جوش نے حالات حاضرہ کے ساتھ اس سیاسی فلسفے کو عملی پیوستگی اور تفہیم کی عملی نفاست، زبان کی NICETIES اُس کی توسیع کی مظہرت، پیوستگی اور تفہیم نیز لمحات کو امکانات کے ساتھ لا کر ایک منظر تیار کر دیا۔

(۲) مَیں اس سوال کو حدیثِ بے خبرانِ ارتقائے اردو ادب سے تعبیر کروں گا پھر جوشؔ کا ایک بند پڑھوں گا ....

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے
کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
ماں کا مزاج باپ کے عادات چھوڑ دے
گھُٹی میں تھے جو حَل وہ خیالات چھوڑ دے
کس جی سے کوئی رشتۂ اوہام توڑ دے
ورثے میں جو ملے وہ اصنام توڑ دے

جدیدیوں اور لسانیات کے ماہرین نے الفاظ کی Etimology اور Syntax کی تو بہت بحثیں اور بڑی بڑی باتیں کی ہیں مگر الفاظ میں کیفیات کی جو ایک تہذیبی دنیا آباد ہوتی ہے (اور یہی تہہ داری ہوگی) جو ان کے گرد و پیش کی سماجی دلچسپیوں، مذاق، جذبات، محسوسات، فکری اُڑان اور شعری تعمیرات کے جوڑ بند، محفل سازی، برمحل جملوں، فقروں کی برجستگی اور پھر اس طبقے میں بھی ایک خاص طبقے کی سپردگی اور ناسپردگی سے ترتیب پاتی رہتی ہے، اُس پر کبھی باتیں نہیں کرتے کہ یہ باتیں شاید ان کی تفہیم اور گرفت سے بہت اونچی ہوتی ہیں۔ جوشؔ کے گرد و پیش اور بطور خاص لکھنوی تہذیب میں جو Socalled اشراف کی دلچسپیاں، ان کے تہذیبی اشارے، گفتگو کے

طور طریقے، ذہنی اُڑان اور الفاظ کے بلند اطراف کی فہم و فراست نیز تفاخر اور ایک طرح کی ELITISTS پسند و ناپسند اور Rejection کا مزاج تھا۔ وہ آج کے ٹوٹ پونجیے اور اردو کے علم لسانیات کے کم سواد مدعی شاید سمجھ ہی نہیں سکتے، نہ انھیں اس تہذیب کے رموز و غوامص معلوم ہیں کیونکہ وہ آج کے اَنام کے مزاج اور تہذیب سے جوشؔ کی شاعری کو آنکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے جوشؔ پر لفاظی اور محض الفاظ کے زور پر اپنی شاعری کو کھڑی کرنے کا الزام لگایا۔ ایسے لوگوں کو جوشؔ کی شاعری میں محض کثرت الفاظ ہی نظر آتی ہے۔ انھیں شاید اس کی خبر نہیں کہ بہت سے مضامین اور خیالات کے لیے ایک خاص طرح کے Set of words لانے ہی پڑتے ہیں تبھی وہ مضامین اپنی کیفیات کھولتے ہیں۔ جوشؔ اور خود اقبالؔ کے یہاں ایسی صورتیں بار بار آتی ہیں۔ اقبالؔ کا ایک شعر جعلی صوفیوں اور مولویوں کے لیے یوں ہے۔؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اب اقبالؔ کی باتوں اور ان کی طنز میں ملی ہوئی حقیقت کی وضاحت بغیر میراث، مسند، ارشاد، زاغ، تصرف اور ان تمام الفاظ کی ایمائیت اور نشتریت کا اندازہ کیے بغیر ان الفاظ کے استعمال کے کہاں ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مُلّایانِ مسجد، ان الفاظ پر برافروختہ ہو کر انھیں بے مصرف اور بیکار بتا کر یا یہ کہہ کر پیش کریں کہ یہ محض اقبالؔ کی گویائی ہے۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ اقبالؔ نے جس تصور کا اشارا کیا ہے ان کے لیے ان الفاظ سے بہتر کوئی دوسرا سیٹ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس میں علوئے فکر، حسن اور شعر کے بہترین پیکر نہاں ہیں۔ تو جب جوش اپنے خیالات کے لیے الفاظ اسی طرح کی کیفیات کے اظہار کے لیے تواتر سے لاتے ہیں تو ان کے مخالفین انھیں بے مطلب اور منٹو کے الفاظ میں ''خالی ڈبے خالی بوتل'' سمجھتے ہیں کہ جب بات چند معمولی الفاظ سے واضح ہو جائے تو اتنے بلند الفاظ اور فکر کی اونچائی کی ضرورت کیا ہے؟ کسی دل جلے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جوش ہاتھی پر بیٹھ کر رائفل سے پدّی کا شکار کرتے ہیں یعنی بات تو کچھ نہیں مگر جوشؔ اسے اپنے الفاظ کے زور پر اُسے بات بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہ نظم کسان کو بھلا کسان کیا سمجھے گا؟

کون ہل، ظلمت شکن قندیلِ بزم آب و گل

قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

''خوشنما کھیتوں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ'' ۔ سے بھلا کسان کیا سمجھے گا۔ پھر خالی بوتل نظم میں ایسے بلند الفاظ کو اتنی بلندی سے پیش کرنا صرف الفاظ پر اپنی قدرت دکھانا ہے اور کچھ نہیں ۔ یہ کون سا اہم موضوع ہے؟ نظم خالی بوتل کے کچھ اشعار جوش کے یہاں دیکھتے ہیں ۔

اے سپہر تاک کے ٹوٹے ستارے السّلام
اے حریم کیف و مستی کے منارے السّلام
اے رشتہء بشکستہ گوہر السّلام
السلام، اے جنتِ بے موجِ کوثر، السّلام
السّلام، اے شیشۂ محروم صہبا، السّلام
السّلام، اے محمل گم کردہ لیلیٰ، السّلام

اب بوتل جس سے شراب غائب ہو چکی ہے اسے محمل کہنا اور شراب کو لیلیٰ کے استعارے کے ساتھ پیش کرنا جوش کی عُلوئے فکر و فن کی معراج ہے ۔اب اگر کوئی اس فکری اور شعری مہارت کو محض لفاظی کہتا اور سمجھتا ہے تو، اس پر بھلا کیا کہا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے اس پیش کش میں تنوع بھی ہے اور تہہ داری تو غضب کی ہے۔ پھر ''سپہر تاک''، ''حریم کیف و مستی''، ''منارے'' (کی معنوی بلندی) ''رشتہء بشکستہ گوہر''، ''جنت بے موج کوثر''، ''محمل گم کردو لیلیٰ'' جیسے ٹکرے تراشنا جہاں تنوع اور تہہ داری کی ایک دنیا آباد ہے معمولی بات نہیں ۔تو آپ کے دوسرے سوال کے لیے میرا یہی خیال ہے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے۔

(۳) دیکھئے میرا خیال ہے کہ 'غزل' کا سارا منظر نامہ مشروطیت، ہیئت، لوازمات، یہاں تک کہ لفظیات کا بھی نظم سے بس زبان اور الفاظ کی ایک خاص صورت تک کے علاوہ کوئی خاص واسطہ نہیں ۔نظم، اطناب کی شاعری ہے اور غزل ایجاز کی اور جوش مکمل طور پر اطناب کے شاعر ہیں ۔ ان کے یہاں غزل کا ایجاز اور اُس کی اختصاریت کیسے اور کیوں آئیں گے؟ اس لئے غزل کی روایتی شعریات پر جوش کی اطنابی، شعری صورتوں کو پرکھنا مناسب نہیں؟ ہاں الفاظ اور تراکیب میں کہیں کہیں مناسبت پیدا ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوش سے ایسا تقاضہ اور امید دونوں نا مناسب

ہیں۔ پھر غزل کے الفاظ میں اختصار، اشاریت، تہہ داریاں، معاملات زندگی کا عطر، جس طرح کشید کر کے سمویا ہوا ملتا ہے وہ محض دل پر گزرنے والی کیفیات کا اظہار ہے۔ نظم اس طرح کہاں چل سکتی ہے؟ نظم میں تو بیرونی دنیا میں ہونے والے واقعات، سانحات، اور اُن سے ترتیب پاتی ہوئی اُس زندگی کی باتیں ہوا کرتی ہوئی ہیں جو سُننے والے کو 'باخبر' 'متحرک اور' 'اقدام' کی طرف مائل کرے (اگر سیاسی، انقلابی، یا انسانی اقدار کی خوبیوں کی طرف متوجہ کرنے کا اشارہ اور جذبہ لے کر نظم آئی ہے۔) اگر نظم، فطرتِ انسانی، اقدار، ملابست، بھائی چارگی کی بات کرتی ہے تو بھی، اُس میں ترغیب، تحریص اور توجہ کی باتیں ہوں گی جو بیرونی دنیا کے لوازمات اور امکانات سے اپنی اور دوسروں سے وابستگی کی تمنا کرے گی، ابلاغ و اقدام کی متمنی ہوگی۔ تو جوش کی اِنکشافی، خارجی اور اظہاریت میں کائناتی امکانات کی طرف متوجہ کرنے والی شاعری بھلا غزل کی روایتی شعریات کے پیمانے پر کہاں پوری اُتر سکتی ہے؟ پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اردو کی ہر طرح کی شاعری صرف غزل کے پیمانے سے کیوں ناپی جائے؟ میں اس سوال کو اسی طرح سے سمجھتا ہوں۔ پھر 'ایجاز' اور 'اطناب' میں جو ''تقریباً'' بعد المشرقین ہے اُسے بھی نظر میں رکھنا چاہئے اور نظم اطناب کی شاعری ہے جس میں ہر دم ارتقائے حیات کے بیرونی امکانات ہی کی باتیں زندگی کو جہت اور جہد عطا کرتی ہیں۔ جسے ''خفیہ گرانِ نغمۂ بے معنی'' سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تو جوش نہ صرف ''غزل کی روایتی شعریات کے پیمانے بھی اُن کے کام نہیں آسکتے کہ حالی، آزاد اور اسمٰعیل کے نظمیہ پیمانوں سے جوش کا دور اور اُن کے مسائل اور پیمانے بھی بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اور ساری تہذیبی، مسائلی اور اظہاریت کی صورتیں بھی بدل چکی ہیں۔ پھر نظم، جو الفاظ بھی قدیم گلاسری سے جوش کے زمانے میں لیتی تھی، اُس کی ترسیلی صورت بھی وہ نہ رہ گئی تھی جس کا نظم تقاضہ کرتی تھی کہ نظم کی ترسیلیت manisided مختلف الجہاتی تھی اور یہ مختلف الجہاتی manisidedness، غزل کی الہامی اظہاریت، تہہ داری اور معنویت سے بالکل الگ تھی۔ بلکہ دونوں کا perception ہی الگ الگ تھا۔ تو غزلیہ نقطۂ نظر یہ جوش کی شاعری کے ساتھ انصاف کسی بھی طرح سے کر ہی نہیں سکتا۔ نہ معنی میں نہ بیان میں نہ اظہاریت میں۔

(۴) ہاں تھوڑے طنز و مزاح کے لئے سوداؔ اور نظیرؔ کی شعری روانی نیز الفاظ کے بہاؤ کے

لئے انیسؔ کی پرچھائیاں ضرور جوشؔ کے یہاں خاصی جھلک اُٹھتی ہیں۔اب جیسے ’گرمی اور دیہاتی بازار‘ کہیں کہیں نظیرؔ کا بلدیو جی کا میلا معلوم ہوتا ہے جیسے

بیل ، گھوڑے ، بکریاں ، بھیڑیں ، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ ، گُڑ کی بُو ، مرچوں کی دھانس
خَربُزے آلو ، کھلی ، گیہوں ، کدو ، تربوز ، گھانس
کملیوں پر سرخ چاول ، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو

(گرمی اور دیہاتی بازار)

یا ، پہلو سی زمیں بدل رہی ہے
ذروں سے دندک نکل رہی ہے

(لُو کی آمد آمد)

انیسؔ کی روایت کی صورت تو یہ ہے کہ جوشؔ نے اپنے مرثیے ہی ، انیسؔ کی روایت میں لکھے ہیں۔کہیں کہیں تو ایک طرح کی متوازیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔بس یہ ہے کہ گلاسری اور پھیلاؤ میں جوشؔ نے ایک Modern Touch دے دیا ہے جو ان کے وقت کا تقاضہ ہے۔ہاں واقعہ نگاری انیس کے یہاں کافی ہے اور اس کے اسباب بھی ہیں اور جوشؔ ، چلتے تو بڑی بلندی سے ہیں مگر جذباتیت میں ڈوب جاتے ہیں۔اور کربلا کے المیہ کو حالاتِ حاضرہ میں ملا لیتے ہیں۔

”تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو
آواز دے رہا ہے زمانہ بڑھو بڑھو
تلوار شمر عصر کے سینے میں بھونک دو“

جیسی باتیں ان کے مرثیے کا اختتامیہ (Culmination) بن جاتی ہیں۔(تمام ایسا نہیں ہے مگر زیادہ تر جذباتیت ہی اُن کے مرثیوں پر چھائی نظر آتی ہے جو وقت کی آواز پر مرتکز ہوتی ہے۔) میرا خیال ہے کہ سوداؔ ، نظیرؔ اور انیسؔ کی شعری روایت جوشؔ کے یہاں بس اسی طرح ہے اور اُسے زیادہ ہونا بھی نہیں چاہیئے کہ جوشؔ اور ان لوگوں کے مسائل ، طریقِ شعری اور پیشکش ، ساتھ ہی ساتھ شعری ڈیمانڈ بھی الگ الگ ہے۔

(۵) جوشؔ کی شاعری ذہنی پھیلاؤ، ہمہ جہتی، یگانگت اور انسان دوستی کی شاعری ہے۔ اُسے ان تنگ نظریات سے کیا واسطہ؟ اوّل تو وہ کسی مذہب کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ اُن کا مذہب انسانیت، اخوت، مساوات اور حُریّت ہے اور بس۔

(۶) یقیناً جوشؔ کی شاعری اس تشدد زدہ اور کشمکشوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک طرح سے مَرہم ہی (Healing Power) کا کام کرتی ہے اور آج بھی کرے گی کہ تمام ترقی پسند شاعری کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے اور آج بھی ہے۔

(۷) راقم اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ جوشؔ کی شاعری میں کوئی مربوط فکر و فلسفہ نہیں ہے۔ اُن کا مربوط فکر و فلسفہ، انسان دوستی، انسانوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کو کوشش اور حد درجہ تعقل پرستی ہے۔ مساواتِ انسانی اور حریّتِ فکر ہے، جس کے لئے جوشؔ تصوّرِ خدا تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں:

یقین بن کے جب تک نہ آئے گا تو
تو اے وہمِ دیرینۂ اہل ہُو
رہِ کفر کی خاک چھانے گا جوشؔ
نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوشؔ

یوں اعتراض کرنے کے لئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ میرؔ ہی کے یہاں کون مربوط فلسفہ، فکر ہے؟ یقیناً نوعِ انسان کے مقدر کے بارے میں جوشؔ ارتقائے حیات کی عملی صورتوں کے موئید تھے اور ارتقائے حیات کو صرف تعقل پسندی ہی صحیح راستہ دکھا سکتی ہے۔ اس پر جوشؔ کا ایمان تھا۔

(۸) یقناً جوشؔ کی شاعری کا کماحقہٗ محاسبہ نہیں کیا گیا۔ اُن کے یہاں جو انسان دوستی، صلح وآشتی، زندگی کی مثبت قدروں اور انسانی بھائی چارے کی باتیں ہیں۔ ان کا محاکمہ کیا جائے تو وہ بہترین انسان دوست (Humanist) عقلیت پرست، تہذیب کے ملاءِ اعلیٰ کو چھوتے ہوئے انسان نظر آئیں گے۔ اپنی رباعیوں اپنی نظموں، اور ہر جگہ انھوں نے انسانوں کی ترقی، ان کے حالات کو بہتر بنانے اور آپس میں صلح وآشتی سے رہنے کی پیشکش کی ہے اور مذہبی بنیادوں پر نفرتوں کی مذمت،

خنجر ہے کوئی تو تیغِ عریاں کوئی

صرصر ہے کوئی تو بادِ طوفاں کوئی
انساں کہاں ہے ، کس کرے میں گم ہے؟
یاں تو کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی

جیسی باتیں ۔ پھر ماتم آزادی جیسی بلند نظم لکھ کر انھوں نے یہ بات اور مکمل کر دی ہے مگر اس طرف ان کے مخالفین توجہ نہیں دینا چاہتے ہیں ۔ایسے ہی لوگوں کے لئے جوش نے کہا تھا........

مہتاب میں دھبے ہیں، گلوں میں کانٹے
بد بیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے

جوش کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا۔علی گڑھ یونیورسٹی کے کچھ نامور اساتذہ علامہ اقبال کو سہیل (غالباً اعظمی) جوش سے بہتر شاعر بنانے اور سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ بھی کچھ مزید باتیں ہیں جو لکھی نہیں جاسکتیں ۔تو جوش ایک معمولی شاعر ثابت کئے جانے لگے۔آج بھی خلیل الرحمٰن اعظمی ،مسعود حسین خاں اور دوسرے علی گڑھ کے اساتذہ کی تحریروں میں جوش کی شاعری میں محض خرابیاں ہی ہیں مگر خیر....یقیناً کبھی کبھی لطف صُحبت گرم رکھنے کے لئے جوش تھوڑے بہت کھلنڈرے ڈھنگ کے شعر کہہ دیتے ہیں۔بس انھیں اشعار کو لے کر لوگ ان کی شاعری کا مذاق اُڑاتے ہیں۔جگر مرادآبادی سے رشید احمد صدیقی بہت متاثر تھے اور جگر صاحب یقیناً اپنے رنگ میں لاجواب تھے بھی ۔ جوش صاحب اپنی گویائی میں ان پر بھی تمسخرانہ ڈھنگ سے کچھ نہ کچھ کہہ جاتے ،اس سے علی گڑھ والے ان سے اور بھی خفا رہتے ۔ایک نظم میں لکھ دیا.....

اگرچہ پہلوئے ذم ہے مگر بقولِ جگر
ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

تو اب اسے چاہے جوش کی شاعری کا کمزور پہلو سمجھا جائے یا کچھ اور۔

(۹) میں جوش کی ہجرت پر سرِ دست کچھ نہیں لکھ سکتا کہ اس کے لئے وقت چاہیے اور تفصیل بھی ۔جس کے آپ متحمل نہ ہو نگے ۔پھر کبھی۔

(۱۰) یقیناً جوش کے شعری سرمایے کو پھر سے ٹھنڈے دل سے آنکنا ضروری ہے کہ وہ اردو شاعری کا ایک بڑا سرمایہ ہے اور اُسے IGNORE کر کے ہم ایک اہم دور اور ایک بڑی شاعری

سے محروم رہ جائیں گے۔ کسی بھی دور کے ادب کو تنگ نظری اور محض کچھ ''خود پسند'' لوگوں کی عینک سے دیکھنا ادب کی روایات، تاریخ اور سماجی دلچسپیوں سے بے خبری ہوگی، جوش کی شاعری، ایک خلفشاری دور کا احاطہ کرتی ہے۔ایسا خلفشاری دور جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے اتار چڑھاؤ، کیف وکم اور شعلہ و شبنم کا بھی دور ہے۔کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے اور جوشؔ کی شاعری، ان سب کا ایک طرح سے ریکارڈ بھی ہے۔اس لئے خرابیوں کے باوجود، کوئی جوشؔ کی شعری تخلیقات سے حرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

شارب ردولوی

(۱)۔اس میں شک نہیں کہ جوش گذشتہ صدی کے ایک منفرد اور ممتاز شاعر ہیں۔ ہماری شاعری میں ان کی تاریخی اہمیت ہے۔اردو میں نئی نظم ہو، جدید مرثیہ ہو یا احتجاجی اور انقلابی شاعری اس کا ذکر جوش کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

(۲)۔میں اس بات سے متفق نہیں کہ جوش کی شاعری ''محض کثرتِ الفاظ'' کی شاعری ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ جوش ہی نہیں پوری اردو شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ۔بعض دوسرے نظم گویوں کے یہاں بھی کثرتِ الفاظ کی مثالیں ملتی ہیں، اسکا انحصار موضوع، علم، جذبے کی شدت، اور قدرتِ اظہار پر ہے۔ ہر شاعر نہ تو اتنی صلاحیت رکھتا ہے، نہ زبان واظہار پر ہر شخص کو اتنی قدرت ہے، جوش الفاظ کا ایک سیلابِ رواں تھے۔سیلاب سے یہ مطلب نکالنا درست نہیں ہوگا کہ خس و خاشاک بھی اس میں بہہ کر آجاتے ہیں۔جوش الفاظ کے معاملے میں غیر محتاط نہیں تھے، الفاظ کی کثرت کے باوجود وہ غیر ضروری الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ان کے انتخابِ الفاظ پر ابتک کام نہیں ہوا، یہ افسوس کی بات ہے۔اسی لئے بعض لوگ اس طرح کی بات لکھ دیتے ہیں۔جوش کے یہاں الفاظ کے استعمال میں خیال اور جذبے کا ارتقا پوشیدہ ہوتا ہے۔ان کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ کثرتِ الفاظ سے تین طرح کے کام لیتے ہیں۔

ا۔معنی کی توسیع

۲۔منظر کی جزیاتی تشکیل

۳۔جذبے کی شدت کا اظہار

ان تینوں باتوں کو پیشِ نظر رکھ کران کے کسی بند یا نظم کے کسی حصہ پر غور کریں تو اس کی تکرار میں پنہا خوبصورتی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔جوش کا مشہور بند ہے۔

سرو سہی ،نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں،انہ برگ بار
جیحو، نہ جامِ جم، نہ جوانی، نہ جوئبار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گل عذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

ایسے خوبصورت Alliteration کی مثال اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ Alliteration کے لئے اردو میں کوئی ایک لفظ میرے ذہن میں نہیں ہے۔اسے ہم صوتِ الفاظ ہی کہہ سکتے ہیں۔ہم صوتِ الفاظ یاAlliteration کو ہمیشہ شاعری کا ایک حسن قرار دیا گیا ہے۔عہدِ وسطیٰ کی عیسائی شاعری Christian Poetry کی ایک ہزار لائن کی ایک نظم میں ہر لفظ سی C سے شروع ہوتا ہے۔الفاظ پر ایسی مہارت کم لوگوں کو حاصل ہوگی۔ یہاں پر ایک مثال اور دینا چاہوں گا جسمیں ایک منظر یا کیفیت کو بیان کرنے کے لئے جوش نے مختلف الفاظ وتراکیب سے کام لیا ہے۔اس مثال کے دینے کا مقصد اپنی بات کی دلیل پیش کرنا ہے کہ جوش اپنے الفاظ وتراکیب سے سہ ابعاری (Three Dimentional) فائدہ اٹھا تے ہیں یعنی معنی کی توسیع ،منظر کی جزیاتی تشکیل اور شدت احساس کا اظہار ان نظم 'بھری برسات کی روح' کے یہ اشعار دیکھئے۔

تیرگی، پُر ہول صحرا، بے اماں، بادل سیاہ
ایک میں اور یہ اندھیری رات کی خونی سیاہ
گھاٹیاں تاریک ،راہیں گم، ہوائیں ناصبور

روح فرسا طاقتوں کی حکمرانی دور دور
ابر پیچ و تاب میں، ہیجان میں آبِ رواں
آسماں بھپرا ہوا، بھیگی زمیں، کف در دہاں
جھینگروں کی تان، بادل کی گرج، پانی کا شور
مینڈکوں کے راگ، بجلی کی کڑک، نالوں کا شور

آج جو شاعری ہے مجھے اس سے شکایت نہیں ہے وقت کی تبدیلی کے ساتھ زبان اور اظہار کے پیمانے تبدیل ہوتے رہے ہیں اب نہ وہ علم زبان ہے اور نہ زبان و بیان پر وہ دسترس ۔اس لیے اسکی توقع کرنا غلط ہوگا۔ پھر ہر عہد کے زبان و بیان کے اپنے معیار اور مطالبات ہوتے ہیں آج کی شاعری کا جوش کی شاعری سے تقابل بے جا ہوگا۔آج کی شاعری کا حسن آج کی زبان، آج کے مسائل اور اظہار و بیان کی روشنی میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

(۳) روائتی غزل کی شعریات پر جوش کی شاعری کو پرکھنا صحیح نہیں ہوگا۔ جوش کے کلام میں تشبیہہ و استعارے، دلکش تراکیب اور خوبصورت ذخیرہ الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی نظمیں غزلوں کے مترادف ہیں۔غزلوں کا آہنگ الگ چیز ہے۔ جوشؔ کی جمال پرستی یا جمالیاتی حسیّت ایک دلکش فضا ضرور پیدا کرتی ہے جسکی وجہ سے انھیں پڑھ کر اسی طرح کے انبساط کا احساس ہوتا ہے جو بہت خوبصورت غزل سن کر ہو۔لیکن اس سے حاصل ہونے والے انبساط کے تجزئے کے لئے پیمانے نہیں ہو سکتے۔ جوشؔ کے پرکھنے کے لیے، جوش کی جمالیات اور جوش کی لسانیات کو سمجھنا ہوگا۔ اس کے بغیر کوئی بھی طریقۂ کار صحیح معنوں میں جوش کی نظمیہ شاعری کی تعین قدر کے لئے کافی نہیں ہوگا۔ جوش کی جمالیاتی حسِ بہت تیز ہے۔حُسن انھیں بہت شدت سے متاثر کرتا ہے وہ خواہ شخصی حسن ہو یا حسن فطرت جسکی اس سے اچھی مثال کیا ہو سکتی ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ان کی نظموں میں ایک مسرت آگیں فضا اور لطیف آہنگ ضرور ہے لیکن اس کے لیے غزل کے Tools صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں معاونت نہیں کر سکتے۔

(۴) میں نہیں سمجھتا کہ سودا، نظیر اور انیس وغیرہ کی روایت کو آج جوش کی شاعری میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے قدماء کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں ہر شاعر کے یہاں مل جائیں گے لیکن براہ راست ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے ان اثرات کے تحت جوش کے یہاں پیش کیا جا سکے۔ جوش خود اردو شاعری کی ایک روائت ہیں۔ انھوں نے مرثئے لکھے اسمیں بھی ہیئت کے علاوہ ان کا راستہ میر انیس سے بالکل الگ ہے۔

(۵) اس میں شک نہیں کہ دنیا ذات، مذہب اور علاقہ میں سمٹتی جارہی ہے اسکا ایک سبب سیاست ہے اور دوسرا سبب ادب سے دوری۔ آج ادب دوسرے درجے کی چیز ہو کر رہ گیا ہے اس کے اسباب کے ذکر کا یہ موقع نہیں لیکن اچھا ادب ہمیشہ تنگ نظری سے نبرد آزما رہا ہے۔ ہماری جدید شاعری میں جوش کا کلام جمالیاتی احساس و انبساط کے ساتھ وسعت نظر کے دروازے کھولتا اور وسعتِ دل کے دریچے باز کرتا ہے۔

(۶) جوش کی شاعری محبت اور انسان دوستی کی شاعری ہے۔ حسن اور کیفیات حسن کی شاعری ہے، احتجاج اور انحراف کی شاعری ہے اور جب تک یہ چیزیں ہیں جوش کی شاعری کی معنویت باقی ہے۔

(۷) آپ کا سوال ہے کہ جوش کی شاعری میں کوئی مربوط فکر و فلسفہ نہیں۔ کسی شاعر سے اسکی توقع کرنا کہ اس کے کلام میں مربوط فکر و فلسفہ ہو درست نہیں۔ شاعر فلسفہ نہیں پیش کرتا اور نہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ پڑھنے والوں کی نگاہ اس میں فلسفہ تلاش کر لیتی ہے۔ یہ سوال اقبال کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا اس لیے اس کے اثرات ان کے یہاں زیادہ نمایاں ہیں حالانکہ فکر و نظر میں ان کے یہاں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ جوش فلسفی نہیں تھے لیکن حیات و کائنات کے بارے میں ان کا اپنا ایک نظریہ تھا جو ان کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے خاص طور پر، الہام و افکار، کی نظموں اور 'نجوم و جواہر' کی رباعیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے ربط دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی ورنہ یہ سوال نہ پیدا ہوتا۔ ان کے یہاں ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے مثلاً وقت کے بارے میں کہتے ہیں۔

دانا ہے تو وقت گذراں کو پہچان

صدیوں کو اٹھائے پھر رہی ہے ہر آن
چپ چاپ گزر رہے ہیں تاریخ بہ دوش
لمحوں کے لباس میں کڑوروں انسان

ایک اور رباعی میں تصورِ وقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

حاصل ہو بشر کو خواہ کتنا ہی کمال
طول ابدیت کا تصور ہے محال
انسان کی جھولی میں فقط چند نفس
اور وقت کے دامن میں کڑوروں مہ و سال

اور خالق کائنات کے بارے میں سوال کرتے ہیں ؎

اے پچھلے پہر کے غم گسارو بولو
اے نور کے ملگجے سے دھارو بولو
اس پردۂ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون

جوشؔ کی نظموں میں بے شمار اشارے ان کے تصورِ انسانیت، تصور زندگی، تصور عبد و معبود، تصورِ عمل کے بارے میں مل جائیں گے جسے مطالعہ جوش میں کبھی مربوط طریقے سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کچھ لوگوں نے مضامین ضرور لکھے ہیں۔

(۸) شاعر کے یہاں کمزور اور توانا دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ کسی کی تمام شاعری ایک معیار یا صرف اعلیٰ معیار کی نہیں ہے۔ غالبؔ نے بہت کوشش کی اور بہت منتخب کلام پیش کیا لیکن وہ بھی کمزور پہلوؤں سے خالی نہیں۔ جوش کی شاعری میں بھی کمزور پہلو ہیں لیکن ان پہلوؤں کا اظہار زیادہ شدت سے ہوا۔ ان کے عقائد کی وجہ سے ایک طبقہ ان کے خلاف رہا۔ انھوں نے ان کی ساری شاعری کو لفظی تکرار کے خانے میں ڈال دیا جو ادبی دیانت داری کے خلاف تھا۔ دوسرے جوشؔ کی شاعری جس توجہ اور علمی تجزیے و تعبیر کا مطالبہ کرتی ہے وہ سامنے نہیں آیا۔

(۹) جوشؔ کی ہجرت سے ان کی شہرت، ان کی شخصیت اور ان کی ادبی اہمیت تینوں کو

نقصان پہنچا۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں کو ان کی ہجرت سے صدمہ اور شکائت تھی اور پاکستان ان کی اُس طرح پذیرائی نہیں کر سکا۔ اس لیے دونوں جگہ ان کی شاعری کا مطالعہ اور تحقیق سے بے نیازی برتی گئی۔ اس سے اردو شاعری کو کیا نقصان پہنچا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جوشؔ کو ضرور نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ یہ جذباتی صورت حال ختم ہو چکی ہے اس لیے اب ازسرِ نو ان کے کلام کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۱۰) آپ کا دسواں سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ جوشؔ کے سرمایۂ شاعری کی ازسرِ نو دریافت ضروری ہے۔ جوشؔ کی ولادت کو ایک سو دس سال اور ان کے انتقال کو ربع صدی سے زائد ہو چکا ہے۔ اس درمیان ادبی اظہار اور زبان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ جوشؔ کی زبان کلاسکیت کے درجے پر پہنچ چکی ہے۔ دوسرے وہ جذباتی صورتِ حال بھی تبدیل ہو چکی جس نے انھیں، 'شاعر شباب' اور 'شاعرِ انقلاب' بنایا تھا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے کلام کا جمالیاتی، لسانی، فکری اور فنی جائزہ لیا جائے اور غیر جانب داری کے ساتھ قدروں کے تعین کی کوشش کی جائے۔

ابوالکلام قاسمی

(۱) مجھے اس بات سے قطعی اتفاق نہیں کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش سب سے ممتاز اور قد آور شاعر ہیں۔ جوش بلاشبہ ممتاز بھی ہیں اور اہم بھی مگر ان کو غیر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال کے بعد اردو میں شعری لہجوں کا اتنا تنوع اور بعض اعتبارات سے اتنے امتیازات کے حامل متعدد شاعر موجود ہیں کہ جوش محض اپنے انداز کے اہم ممتاز شاعر قرار پاتے ہیں۔

(۲) جوش کی شاعری کثرتِ الفاظ کی شاعری ضرور ہے مگر محض کثرتِ الفاظ کی شاعری نہیں۔ تاہم کثرتِ الفاظ شعری روایت میں کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اپنے زمانے کی مستعمل کثیر الجہت لفظیات کو شاعری میں استعمال کر کے شعری سرمایے میں اگر عمودی انداز میں نہیں تو کم از کم افقی انداز میں ضرورت وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں انیس اور نظیر اکبر آبادی کے بعد محض جوش ہی ایسے شاعر ٹھہرتے ہیں جنہو نے زندگی کے بیش تر تجربے اور برتاؤ کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کو شعری دستاویز کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے، یہ بات درست ہے کہ عجز اظہار کے زمانے میں جوش کی قدرت اظہار کو مثبت طور پر یاد کیا جانا چاہئے۔ جہاں تک تنوع اور تہہ داری کا سوال ہے تو تنوع اور تہہ داری کے بغیر اچھی شاعری تو ضرور ہو سکتی ہے۔ بڑی یا غیر معمولی سطح کی شاعری کا امکان نہیں ہوگا۔

(۳) غزل کی روایتی شعریات کے پیانے پر جوش کی نظمیہ شاعری تو دور کی بات ہے ۔کسی بھی شاعر کی نظم نگاری کو نہیں پرکھا جا سکتا۔اس لئے کہ غزل کی شعریات میں رمز و ایما اور استعارہ و علامت کا جو مقام ہے اس سے انصاف نظم کی شاعری بالعموم نہیں کر پاتی۔

(۴) سودا، نظیر اور انیس کی شعری روایت کے عناصر جوش ملیح آبادی کی شاعری میں بجا طور پر تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔مگر چونکہ جوش کا طنز ملیح ،نظیر کی سماجی بیداری اور انیس کے محاسن شعری کو بخوبی برت لینا جوش کے بس کی بات نہیں ،اس لئے ان شاعروں سے مماثلے کے باوجود، جوش اپنی روایت آپ بناتے ہیں، اور اسی باعث جوش کی تفہیم و تحسین کے پیمانے خود جوش کی شاعری کی مدد سے ہی بنائے جا سکتے ہیں۔

(۵) جوش کی شاعری کو وسعت اور رنگا رنگی ہر طرح کی تنگ نظری اور وسیع المشر بی کے زمانے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(۶) جوش کی شاعری آج کے تشدد اور کشمکش کے حالات میں کچھ زیادہ با معنی ہو گئی ہے۔

(۷) بلاشبہہ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں مربوط فکر و فلسفہ نہیں تاہم ان کے نقطۂ نظر میں اکثر فلسفیانہ انداز شامل ہو جاتا ہے مگر غور سے دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے۔ جوش کے فلسفیانہ نکات میں علامہ اقبال کی بازگشت جگہ جگہ سننے کو ملتی ہے۔ جوش منفرد فکر و فلسفہ کے مالک نہیں تھے۔ان کا بارعب لہجہ ہمیں اپنے کمزور لمحات میں ایسا باور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ورنہ حقیقت حال اس سے خاصی مختلف ہے۔

(۸) جوش ملیح آبادی کی شاعری کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی اکثر نقادوں نے کی ہے مگر اردو تنقید ابھی تک یہ حوصلہ مہیا نہ کر پائی کہ وہ جوش کی شاعری کے مثبت عناصر کی صحیح نشاندہی کر سکے۔ ناچیز کی رائے میں جوش اپنے ذخیرۂ الفاظ کی وجہ سے ایک ممتاز شاعر ضرور ہیں مگر الفاظ کے بے جا استعمال کے سبب ان کو معتوب بھی گردانا گیا ہے۔ ترقی پسند تنقید کی ذمہ داری تھی کہ وہ پس ماندہ طبقات کی ترجمانی، جاگیردارانہ اقدار وعناصر کی تضحیک اور ڈکشن کی جلالت کی بنیاد پر ان کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کرنے کی کوشش کرتی۔ جوش کے یہاں اگر تکرار ملتی ہے تو اس تکرار کی کچھ نہ کچھ معنویت ضرور ہے۔ اردو شاعری کی اولیت میں تہہ دار اسلوب کے ساتھ بیانیہ اسلوب کی اہمیت بھی رہی ہے۔ اس لیئے جوش کا بیانیہ انداز اس لئے زیادہ مذموم نہیں کہ ان کے یہاں بیان محض کم ملتا ہے۔ وہ اپنے بیانات کو شاعرانہ بیانات بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کی خطابت یقیناً ان ی شاعری کو کمزور کرتی ہے۔ تاہم اگر تکرار غیر ضروری نہیں تو مذموم بھی نہیں۔

(۹) یہ سوال ایسا ہے جس کا جوش کی شاعری یا شاعرانہ مرتبے سے کوئی علاقہ نہیں۔

(۱۰) جوش ملیح آبادی کی شاعری کو سمجھنے، اس کی قدر و قیمت متعین کرنے اور اس کی تفہیم و تحسین کے لئے رائج تنقیدی پیمانوں سے ماورا ہونے کی ضرورت ہے۔ جوش اردو کی شعری روایت کی ایک اہم کڑی ہیں۔ وہ نہ تو محض اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ بقول ترقی پسند نقادوں کے ان کا شاعرانہ طمطراق، بلند آہنگی یا خطابت ان کو اہم شاعر بناتی ہے اور نہ محض اس لئے چھوٹے شاعر ہیں کہ بقول جدیدیت کے پیروکار نقادوں کے ان کے یہاں تہہ داری اور رمزیت نہیں پائی جاتی۔ ہماری روایت میں لہجے کی علویت کو جو مقام حاصل ہے وہ یقیناً جوش کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے۔

اخیر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہماری تنقید میں مستحکم بنیادوں پر کسی شاعر اور ادیب کو بڑا یا چھوٹا ثابت کرنے کا رویہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اس نوع کے استفسارات بھی ہمیں کسی مفید اور کارآمد نتائج تک بالعموم نہیں پہنچاتے۔

عباس زیدی (کنیڈا)

(۱) میں دیکھتا ہوں کہ جوش کا جذباتی اور ذہنی رشتہ کن لوگوں کے ساتھ ہے اور اقبال کا جذباتی اور ذہنی رشتہ کس کے ساتھ ہے۔ جب میں انکی شاعری کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال مسلمانوں کے بہت بڑے شاعر ہیں اور جوش انسانیت کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ مجھے اقبال اور جوش میں یہی فرق نظر آتا ہے۔ رویندر ناتھ ٹیگور، کبیر داس، گاندھی، نیوٹن، آئنس ٹائن، مارٹن لوتھر کنگ اِن تمام لوگوں کو اگر جوشؔ کی بعض نظموں کو سنایا جائے تو وہ واہ واہ کریں گے۔ اس کے مقابلے اگر اقبال کے بعض کلام کو ایران میں سنائیں یا ترجمہ کر کے عربوں کو سنائیں یا پاکستان میں سنائیں تو وہ بہت واہ واہ کریں گے۔ میرے نزدیک اِن دونوں میں یہی فرق ہے۔ جوش انسانیت کے بہت بڑے قد آور شاعر ہیں اور اقبال مسلمانوں کے بہت بڑے شاعر ہیں۔

(۲) جوش کی شاعری محض کثرتِ الفاظ کی شاعری نہیں ہے۔

آج شاعری کی جو صورتِ حال ہے اسکے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ بعض لوگ شاعری اِس لئے کر رہے ہیں کہ اس سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے۔ لوگوں میں یہ وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ بھی شعر کہتے ہیں۔ اگر مجموعہ شائع ہو جائے تو وہ اپنے کو صاحبِ دیوان شاعر کہہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو کم از کم میں شاعر نہیں مانتا۔ لاکھ ان کو دنیا شاعر مانے میں نہیں مانتا۔ اس میں چاہے اُن کا بہت بڑا نام ہو۔ جب تک تہہ داری نہ ہو تنوع نہ ہو، Conflict نہ ہو جب تک pain نہ ہو جب تک سوال نہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جب تک الفاظ کا جو shade ہے preccession نہ ہو وہ میرے نزدیک شاعری نہیں ہے۔ اس لحاظ سے آج کل جو شاعری ہو رہی ہے، جو بالی وُڈ میں بہت مقبول ہے، مشاعرے پڑھے جا رہے ہیں۔ وہ میرے نزدیک شاعری نہیں ہے۔ اگر ہم اُردو شاعری کی روایت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں جوش ایک بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۳) یہ ایمانداری کا سوال ہے۔ غزل کا جو مزاج ہے وہ جوش صاحب کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ غزل کے پیمانے پر اگر جوش کو پرکھیں گے تو ان کی شاعری پھسپھسی لگے

گی ۔ غزل اور جوش کا مزاج مختلف ہے ۔ میرے نزدیک جوش صاحب کی شاعری کو اگر غزل کی کسوٹی پر پرکھا گیا تو ان کی شاعری اتنی اچھی نہیں لگے گی ۔ اس کے مقابلے جوش صاحب کی شاعری کو ان کسوٹی پر کسا گیا جن پر Shakespeare ، رویندر ناتھ ٹیگور ، خیام وغیرہ کو کسا گیا تو آپ کو احساس ہوگا کہ جوش بہت بڑے شاعر ہیں ۔ غزل کا اپنا مزاج ہے ، اپنی نزاکت ہے ، مختلف قسم کا طریقہ ہے جو جوش کے یہاں مجھے اتنا متاثر نہیں کرتا ۔ اس کے مقابلے مجھے فیض بہت متاثر کرتے ہیں ۔

(۴) بالکل ضرورت ہے ، قطعی ہے ۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ آپ اگر کسی پیڑ کے پھولوں کو دیکھ رہے ہیں ۔ اس کی کیمیائی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی جڑوں تک جانا پڑے گا ۔ اگر آپ Botanist نہیں ہیں تو آپ کو پھول کی پوری ترکیب سمجھ میں نہیں آئے گی ۔ خاص کر جوش کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اُردو شاعری کی جڑوں تک جانا پڑیگا ۔

(۵) یہ جوش کا امتیازِ خاص ہے ۔ اُردو کے جتنے شعرا ہیں وہ ایک طرف اور جوش ایک طرف ۔ جو عصری فلسفیانہ رجحانات ہیں ، انسانیت جہاں پر کھڑی ہے ، انسانی اقدار کے جو ذہنی Leader ہیں وہ جس طرف اشارہ کر رہے ہیں ، جوش بھی اسی طرف اِشارہ کر رہے تھے ۔ اور اسی طرف جانے کی بات کر رہے تھے ۔ اُردو شعرا میں اس اقدار کے حامی نظر نہیں آتے ۔ غالب پہلے شاعر تھے جہاں فلسفیانہ معاملات تھے لیکن ان کا زمانہ دوسرا تھا ۔ جوش صرف اس بات کی فکر کر رہے تھے کہ اس کائنات میں جو مختلف قوانین ہیں جس پر یہ کائنات گھوم رہی ہے ۔ اُس کو سمجھیں ۔ ان کے نزدیک مذہب ، قوم ، جنس وغیرہ بالکل بے معنی چیزیں ہیں ۔ جوش کی شاعری میں یہ نظریہ بالکل عیاں ہے ۔

(۶) میرے خیال سے جوش شعوری یا لاشعوری طور پر رویندر ناتھ ٹیگور کے شعری خیالات سے متاثر رہے ۔ مجھے نہیں پتہ کہ جوش کا رابطہ ٹیگور سے تھا یا نہیں لیکن اُس وقت جو چند Giant (غیر معمولی) ہستیاں تھیں اس میں اقبال ایک طرف تھے رویندر ناتھ ٹیگور دوسری طرف تھے ۔ جوش صاحب بیچ میں تھے ۔ میرے خیال میں جو تشدد اور کشمکش ہے اس میں جوش رویندر ناتھ ٹیگور کے قبیلے کے آدمی تھے ، نہ کہ اقبال کے ۔

(۷) قطعی طور پر میں اس سے اتفاق رکھتا ہوں ۔ مربوط فکر و فلسفہ یہ بہت مزہ دار ترکیب ہے۔ میرے خیال سے تو اگر شاعر، شاعر نہ ہو تو نبی بن جائے ۔ یا دینی رہبر ہو جائے۔ شاعر تو شاعر اس لئے ہوتا ہی ہے کہ اسکی شخصیت میں، عمل میں، اسکی فکر میں اس قدر تنوع، اس قدر تصادم اور Conflict ہوتا ہے کہ صرف یہی ممکن ہے کہ شاعر شعر کی صورت میں اس کے اندر جو خود بود اور جلن ہو رہی ہے، اس کو پتہ ہے کہ عقل و فکر ایک طرف اشارہ کر رہی ہے اس کی عادات اور جبلّت دوسری طرف کھینچ رہی ہے۔ تو مربوط فکر و فلسفہ کے لئے شاعری نہیں ہے۔ فکر و فلسفہ کے لئے نثر زیادہ بہتر ہے۔

(۸) جوش کے یہاں الفاظ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ وہ اسے اتنی نزاکت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، خیال و جذبات کی اتنی معنی خیز عکاسی کرتے ہیں۔ اسے باریکی اور چابک دستی سے برتتے ہیں کہ ہر شخص اُس اُتار چڑھاؤ اور نازک بیانی کو سمجھ نہیں پاتا۔ یہ جوش کی کمزوری نہیں بلکہ میرے نزدیک یہ Strength ہے۔ جس طرح کلاسیکی موسیقی سب کو پسند نہیں آتی اسی طرح جوش بھی سب کو پسند نہیں ہیں۔

(۹) ہاں، نقصان ہوا ہے۔ انھیں بھی اور اُردو شاعری کو بھی۔ اصلاً ان کے مزاج کی جو شاعری تھی جس کا تعلق دہلی اور لکھنؤ کی زبان و تہذیب سے تھا، اسکے پذیرائی کرنے والے پاکستان میں بہت کم تھے۔ پاکستان میں جو Leader بنے چاہے وہ مذہبی ہوں یا ثقافتی ہوں یا فوجی ہوں ان کے مزاج میں قبیلہ بندی بہت تھی۔ جوش جہاں عقل و ادراک کی بات کر رہے ہیں وہاں لوگ سطحی جذبات کی بات کر رہے ہیں۔ جوش اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔ جب وہ پاکستان گئے تو انھیں وہاں بہت تکلیف پہنچی۔ اس وجہ سے اُردو شاعری کو بھی تکلیف پہنچی۔ نسبتاً جو چھوٹے لوگ تھے، انھیں بہت سراہا گیا۔ جوش زبان اور فکر کے لحاظ سے اتنے قد آور تھے انھیں نیچے کھینچا گیا۔ بجائے اس کے کہ انھیں انسانیت کی کسوٹی پر کسا جائے ۔ انھیں دوسری مختلف کسوٹیوں پر جیسے مذہب کی کسوٹی پر، جنسی رجحانات وغیرہ کی کسوٹی پر غرض کہ ان کی نجی زندگی کی کسوٹی پر رکھ کر انکے وقار اور ان کی position کو خراب کیا گیا۔

محمد علی صدیقی کی جوش فہمی

مصنف :۔ محمد علی صدیقی

مبصر :۔ قمر رئیس

جوش فہمی یا جوش شناسی کی راہ میں جو سب سے بڑی قوت حائل رہی ہے وہ جوش ملیح آبادی ہیں۔ وہ جبلی طور پر شاید اُردو ادب کے سب سے بڑے No Conformist تخلیق کار تھے۔ اُردو میں اس ترکیب کا ترجمہ 'غیر مقلد' ہوگا۔ لیکن ایک مذہبی اصطلاح ہونے کی وجہ سے یہ انگریزی ترکیب کی تہ داری کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ باغی لفظ سے اس کا معنوی تشخص کیا جائے۔ بغاوت جوش کی سرشت کا حصہ تھی۔ اور ہمہ جہت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے، خود اپنی ذات سے بھی باغی تھے۔ رواجی عقائد، شعر و ادب کی روایات، سماجی اقدار، وراثت میں ملے تصورات (جاگیرداری کے کچھ تہذیبی مسلمات کو چھوڑ کر) وہ اپنے عہد کے ادارے اور ہر رویہ پر سوالیہ نشان ہی نہیں لگاتے تھے۔ جذباتی شدومد سے اس کے حریف بن جاتے تھے۔ صرف یہی نہیں وہ اُن مسلکوں اور نظریوں کو نظرِ استحسان سے دیکھنے لگتے تھے۔ جو بغاوت کا شائبہ رکھتے تھے اور پھر ان سے بھی سرکشی اختیار کر کے اپنے اصل موقف Non Conformism پر ایمان کو تازہ کر لیتے تھے۔ ایک مشکل یہ تھی کہ ان کے باغیانہ سروکار گہری رومانی افتاد کی وجہ سے صرف جذباتی نہیں تھے۔ ان کے اس اجتہادی جوش کے پیچھے انیسویں صدی کے تعقل پسندانہ رویے بھی کام کرتے تھے۔ اور بقول محمد علی صدیقی اس طرح مسلمہ عقیدوں پر ایمان سے ملنے والے، سکون و آسودگی کو انہوں نے سدا کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلسل باطنی اضطراب کی آنچ میں سلگتے رہے اور ان کا وجود بہ ہمہ رُخ اور ان کی شاعری بہ ہمہ جہت مجموعۂ اضداد نظر آنے لگی۔ شاید یہ ایک بڑی وجہ رہی کہ اُن کی فکرِ سخن کے

اس گھنے جنگل میں داخل ہونے کی جرأت اور حوصلہ کہیں نظر نہیں آتا۔ گزشتہ نصف صدی میں اُن کی تخلیقی شخصیت اور شاعری نیز آپ بیتی 'یادوں کی برات' کے حوالے سے جو مضامین ضبطِ تحریر میں آئے ان میں سے بیشتر یا تو سرسری جائزے ہیں یا پھر معاندانہ یا عقیدت مندانہ فرمائشی نوشتے جوش فہمی کے حوالے سے سید احتشام حسین اور خورشید علی خاں کی دو اہم تصانیف کے بعد صرف ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہیں جنہوں نے اس بارِ گراں کو اُٹھانے کی جرات کی ہے۔ اپنے نہایت آزمودہ، روشن اور جدید اوزاروں کے ماہرانہ استعمال سے، جوش کی پیچ دار، الیلی اور تخلیقی شخصیت کے کچھ بنیادی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا جتن کیا ہے۔ اس کتاب میں کم و بیش وہی دانش و بصیرت کا فرما ہے جو سرسید اور اقبال جیسے دو عبقری اور مفکر ادیبوں کے بارے میں ان کی تنقیدی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ جوش شناسی کے میدان میں یہ تصنیف کوئی مربوط اور جامع مطالعہ Thises پیش نہیں کرتی۔ اس کے باوجود جوش کے تنقیدی مطالعہ میں اور جوش فہمی سے جڑے نئی پیڑھی کے نقادوں کو ایسے نادر خطوط اور خاکے مہیا کرتی ہے جن سے جوش فہمی کا آگے کا سفر طے ہونے میں آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں چار مضامین شامل ہیں۔ جو تقریباً چالیس صفحات کو محیط ہیں۔ ایک مقالے میں جوش کی رومانوی شاعری کے پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کا سفر تخلیقی روح ادب، کی فطرت پرستی اور احساس ربودگی سے شروع ہو کر روایت شکنی اور سماجی تبدیلی کی باغیانہ خواہش تک پہنچتا ہے۔ یہیں سے احتجاج اور سرکشی کی لے شروع ہوتی ہے جو اُنہیں تعقل دوستی کی راہ دکھاتی ہے اور وہ پکار اُٹھتے ہیں:

نو خواستہ شاعرو! ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یونہی رہے گی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچو!
کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

ڈاکٹر صدیقی نے ایک دوسرے مضمون میں جوش کی فکری اور شعری روایت کا جائزہ لیا ہے۔ مذہبی رسوم کی پابندی سے گریز، حقائق کی تلاش، غزل کی شاعری سے انحراف اور باغیانہ

سروکاروں میں الجھنا۔۔ یہ سب اُن کی تخلیقی سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔اسی حصہ کے ایک دوسرے مضمون 'جوش اُردو شاعری کا نیا موڑ' میں ڈاکٹر صدیقی نے روح ادب کے حوالے سے جوش کی شاعری کے نئے اسلوب کی تفہیم کی ہے۔علامہ اقبال جیسے دراز قد ابھرتے ہوئے شاعر کے مقابلے میں جوش کو اپنے تشخص کی تلاش تھی۔اس لیے وہ اس پہلے مجموعہ میں رومانوی وفور کی ساری توانائی کے ساتھ طلوع ہوئے۔جس کی داد اکبر الہ آبادی ایسے بزرگ شاعر نے بھی دی۔ڈاکٹر صدیقی نے بڑی ژرف بینی سے جوش کے تخلیقی وجود کی ابتدائی تشکیل کے اس مرحلہ پر نظر ڈالی ہے۔لیکن اس حصہ کا سب سے اہم مضمون 'جوش اور عظمتِ انسان' ہے دراصل عظمتِ انسان کا تصور جوش کی شاعرانہ فکر کا کلیدی حصہ ہے جو آگے چل کر وحدت انسانی کے ان کے اہم تصورات سے گھل مل جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بجا طور پر اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔یہ جوش کی وہ روایت ہے جس نے ترقی پسند اور دوسرے روشن خیال شعرا کی انسان دوستی کو سیراب کیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ کے تین مضامین میں ڈاکٹر صدیقی نے 'روح ادب' سے محراب و مضراب' تک (جو آخری مطبوعہ شعری مجموعہ ہے) سے فن کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا ہے۔لیکن اختصار کے باوجود یہ جائزہ سرسری نہیں ہے۔انہوں نے جوش کی نظموں کے سیاسی اور سماجی محرکات کے علاوہ ان کی شخصی اور ذاتی زندگی کے گوشوں کی چھان پھٹک بھی کی ہے اور کئی متنازعہ مسئلوں کو بھی خوبی سے نشان زدہ کیا ہے۔پھر یہ بھی کہ مطالعہ میں کہیں بھی عقیدت کے جذبے کو دخل نہیں ہونے دیا۔البتہ ان کی سخنوری اور سوچ کے بنیادی اور مثبت پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

> ''جوش کی شاعری کسی ایک فکری نظام کی تابع نہ ہو سکی۔ان کا غالب رجحان کچلے ہوئے عوام کی طرفداری اور حسن کے آگے سپر اندازی کی جانب مائل ہے۔وہ کبھی خدا کے بے پناہ عارف اور خدئے مجسم کے خلاف، کبھی امیروں کو رگیدنے میں مزہ لینے والے اور کبھی غریبوں کی ایسی خبر لیتے ہیں کہ الامان۔''

مضمون میں ڈاکٹر صدیقی نے جوش کی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی منفرد خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر چہ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ ان کے فن کی اساسی پہچان 'شعلہ و شبنم' سے ہی قائم ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر صدیقی نے جوش کی مرثیہ نگاری پر بھی ایک جامعہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ فی الاصل ان دیباچوں پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر صدیقی نے جوش کے بارے میں شائع ہونے والی اہم کتابوں پر لکھے ہیں۔ ان میں شاید سب سے اہم جوش کے نہایت معتبر اور مقرب دوست خورشید علی خاں کی تصنیف 'ہمارے جوش صاحب' ہے۔ اس کتاب میں جوش کے ایسے راز ہائے درون پردہ بھی سامنے آتے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے اور جو جوش کی شخصیت کی تفہیم میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح راغب مراد آبادی نے 'خطوط جوش' کے نام سے جوش کے جو خط مرتب کیے ہیں۔ محمد علی صدیقی نے اس کے دیباچہ میں ان خطوط کی اچھوتی معنویت پر بھی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ صرف یہی نہیں جوش کے نزاعی انٹرویو اور پاکستان میں جوش کی مخالفت کے بعض پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

کتاب کے آخری حصہ میں جو ضمیمہ ہے صدیقی صاحب نے جوش کی تفہیم کے لیے دو معنی دستاویزات کو شائع کر دیا ہے۔ ایک ہے شاہد احمد دہلوی نے مضمون ''جوش ملیح آبادی .... دیدہ و شنید '' اور دوسرا ہے اس کا مدلل جواب ''ضرب شاہد بہ فرق شاہد باز'' شاہد احمد دہلوی نے مضمون میں جوش سے برہم ہو کر ان کی مذمت میں جس طرح کے اتہام لگاتے تھے۔ جوش نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں اصل حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے پورے استدلال سے، اُن کو مسترد کیا ہے....... جوش شناسی میں یہ دونوں مضامین دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں ڈاکٹر صدیقی نے معروضی تجزیہ اور استدلال کے ساتھ کتاب کے آخر میں جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے اختلاف مشکل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''جوش صاحبِ نظام فکر شاعر نہیں ہیں لیکن جوش کے یہاں حسن اور عقل کے لیے سپردگی اور عقل کو رہبر فکر بنانے پر اصرار انہیں ایک ایسا شاعر ضرور بنا دیتا ہے جس کا مثل اُردو شاعری میں موجود نہیں ہے.......... جوش کی شاعری کی شعری روایت کے تناظر میں اپنا اثبات چاہتی ہے ۔''

(۷) قطعی طور پر میں اس سے اتفاق رکھتا ہوں۔ مربوط فکر و فلسفہ یہ بہت مزہ دار ترکیب ہے۔ میرے خیال سے تو اگر شاعر، شاعر نہ ہو تو نبی بن جائے۔ یا دینی رہبر ہو جائے۔ شاعر تو شاعر اس لئے ہوتا ہی ہے کہ اسکی شخصیت میں، عمل میں، اسکی فکر میں اس قدر تنوع، اس قدر تصادم اور Conflict ہوتا ہے کہ صرف یہی ممکن ہے کہ شاعر شعر کی صورت میں اس کے اندر جو خود بود اور جلن ہو رہی ہے، اس کو پتہ ہے کہ عقل و فکر ایک طرف اشارہ کر رہی ہے اس کی عادات اور جبلّت دوسری طرف کھینچ رہی ہے۔ تو مربوط فکر و فلسفہ کے لئے شاعری نہیں ہے۔ فکر و فلسفہ کے لئے نثر زیادہ بہتر ہے۔

(۸) جوش کے یہاں الفاظ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ وہ اسے اتنی نزاکت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، خیال و جذبات کی اتنی معنی خیز عکاسی کرتے ہیں۔ اسے باریکی اور چابک دستی سے برتتے ہیں کہ ہر شخص اُس اُتار چڑھاؤ اور نازک بیانی کو سمجھ نہیں پاتا۔ یہ جوش کی کمزوری نہیں بلکہ میرے نزدیک یہ Strength ہے۔ جس طرح کلاسیکی موسیقی سب کو پسند نہیں آتی اسی طرح جوش بھی سب کو پسند نہیں ہیں۔

(۹) ہاں، نقصان ہوا ہے۔ انھیں بھی اور اُردو شاعری کو بھی۔ اصلاً ان کے مزاج کی جو شاعری تھی جس کا تعلق دہلی اور لکھنؤ کی زبان و تہذیب سے تھا، اسکے پذیرائی کرنے والے پاکستان میں بہت کم تھے۔ پاکستان میں جو Leader بنے چاہے وہ مذہبی ہوں یا ثقافتی ہوں یا فوجی ہوں ان کے مزاج میں قبیلہ بندی بہت تھی۔ جوش جہاں عقل و ادراک کی بات کر رہے ہیں وہاں لوگ سطحی جذبات کی بات کر رہے ہیں۔ جوش اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔ جب وہ پاکستان گئے تو انھیں وہاں بہت تکلیف پہنچی۔ اس وجہ سے اُردو شاعری کو بھی تکلیف پہنچی۔ نسبتاً جو چھوٹے لوگ تھے، انھیں بہت سراہا گیا۔ جوش زبان اور فکر کے لحاظ سے اتنے قد آور تھے انھیں نیچے کھینچا گیا۔ بجائے اس کے کہ انھیں انسانیت کی کسوٹی پر کسا جائے۔ انھیں دوسری مختلف کسوٹیوں پر جیسے مذہب کی کسوٹی پر، جنسی رجحانات وغیرہ کی کسوٹی پر غرض کہ ان کی نجی زندگی کی کسوٹی پر رکھ کر انکے وقار اور ان کی position کو خراب کیا گیا۔

جوش ملیح آبادی کی چُنی ہوئی کویتائیں (ہندی)

مُرتب:۔علی احمد فاطمی

مُبصّر :۔ راجیند رکمار

ہر زبان میں ایسے ادیب ہوتے ہیں جو اپنے وقت کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی ہر چند کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے وقت کے نقاد ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔اردو زبان میں ایسے ہی ادیبوں میں ایک کا نام ہے جوش ملیح آبادی۔ جوش کی ادبی شخصیت سے ہندی کے قارئین سے ایک مکمل تعارف کروانے کی غرض سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے جوش کی شاعری کا ایک بہترین انتخاب ناگری رسم الخط میں پیش کیا ہے اس کے لیے ہم سب کو ڈاکٹر فاطمی کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ یہ انتخاب ''جوش ملیح آبادی کی چنی ہوئی کویتائیں'' نام سے شائع کیا گیا ہے۔اس کتاب میں جوش کی کویتاؤں کے کئی رنگوں سے واقف ہونا کسی بھی ہندی قاری کے لئے ایک بہت ہی تازگی بھرا تجربہ ہوگا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہندی ہی نہیں اردو کے قارئین کو بھی لگے گا کہ یہ کتاب ان کے لیے جوش کو ایک ایسے روپ میں سامنے لانے کی ایماندار کوشش ہے جو اب تک طرح طرح کی بحثوں کے کہرے میں ڈھکے رہنے کی وجہ سے سامنے نہیں آسکا تھا۔ ڈاکٹر فاطمی نے اردو تنقید کو جوش کے ساتھ کی گئی ناانصافی کے الزام سے بری کرنے میں جو قدم اُٹھایا ہے اس کا استقبال ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے قارئین کریں گے۔ایسی امید ہے۔

اس کتاب کی اہمیت شروع میں دیے گئے دو مضامین سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پہلا مضمون ہے.....اقبال حیدر صاحب کا.....'جوش ہی کیوں'......اقبال حیدر نے کئی اہم اطلاعات اپنے مضمون میں دی ہیں۔ جیسے ''نہرو ان کے ناز اُٹھانے والوں میں سے تھے۔'' علی سردار جعفری نے کیلگری (کینڈا) میں ایک بار تذکرہ کیا تھا کہ 1954 میں تقریباً پنڈت نہرو نے جوش کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرانے اور نوبل ایوارڈ کے لئے بھجوانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر وہ جوش کی ہجرت کا شکار ہوگیا۔ جوش کی ذاتی زندگی اور ان کے ادبی سفر کی بہت بڑی ٹریجڈی کا

ذکر بھی اقبال حیدر کرتے ہیں۔ ''ہندوستان نے انھیں چلے جانے پر معاف نہیں کیا اور پاکستان نے چلے آنے پر''۔ ساتھ ہی جوش کی ہجرت پر اقبال حیدر کا یہ بے باک کمنٹ بھی غور طلب ہے۔ تاریخی پس منظر میں تو جوش نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر کمزور سوچ کا ثبوت ضرور دیا۔''

دوسرا مضمون خود اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر فاطمی کا ہے۔ ڈاکٹر فاطمی کا ماننا ہے کہ ''اردو نظم کے اقبال کے بعد جوش ملیح آبادی بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔'' اس بات پر بحث ہو سکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش اپنے مزاج کے خود اکیلے شاعر ہیں۔ اکیلے کا مطلب یہ نہیں کہ جس سماجی مواد کو جوش نے ترجیح دی، وہ مواد کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اکیلے کا مطلب یہ ہے کہ جس شعور اور جس انداز میں جوش نے اپنے مواد کو ڈھالا وہ شعور اور وہ انداز کسی اور میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر فاطمی ٹھیک کہتے ہیں کہ...... ''انھیں صرف شاعر شباب یا شاعر انقلاب کہہ کر بات ختم کر دی گئی۔'' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بقول پروفیسر احتشام حسین ......''جوش شاعرِ حیات ہیں۔'' احتشام صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر فاطمی کہتے ہیں کہ جوش شاعر حیات اس لئے ہیں کہ ان کی شاعری کا کینوس بڑا ہے الفاظ کی دنیا بھی بڑی ہوتی ہے۔ جوش کی شاعری اگر اردو غزل کے استادوں کے مقابلے پر کھی جائے تو انصاف نہیں ہوگا۔ نظم کی جمالیات جوش کی شاعری میں جو شکل لے کر آتی ہے اسے غزل کے مزاج سے ملا کر دیکھے جانے سے بہت سے کنفیوژن پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات ایکدم دُرست ہے کہ جوش کو سمجھنے میں مارکسی چوکھٹا بھی بہت کام کا نہیں ہو سکتا۔ بقول فاطمی ...... ''جوش کی شاعری میں ہندوستان اور اس کا حسن دھڑک رہا ہے۔''

جوش کی شاعری کے جو حصے اس کتاب میں شاملِ کئے گئے ہیں ان میں کئی رنگ ہیں۔ جوش کی شخصیت کی جو اکہری امیج بنائی جاتی رہی ہے اس کے برعکس جوش کو ہم اس کتاب میں اس طرح بازیافت کرتے ہیں کہ ان کی افادیت آج کے وقت میں اور بھی یادہ محسوس کرتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی نادرو غیر مطبوعہ تحریریں

مُرتب :۔ ہلال نقوی
مُبصّر :۔ اکبر حیدری

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب میں جوش کی نظم و نثر کے ان شہہ پاروں کو یکجا کر کے مرتب کیا ہے جو انہوں نے مختلف لوگوں اور دوسرے ذریعوں سے حاصل کئے۔ اردو والوں نے جوش کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ خود شاعروں نے جو ان کے سامنے ٹک نہیں سکتے تھے ان کی مخالفت کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا۔ بعضوں نے ان پر غدّاری کا الزام لگایا اور کچھ لوگوں نے حکم کفر صادر کیا تھا۔ یہ مخالفت ان کے انتقال کے بعد بھی جاری ہے۔

جوشؔ باغ و بہار اور عظیم عظمتوں کے آدمی تھے۔ وہ انسان دوست تھے ان میں ذرا بھی تعصب نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی سحر بیانی اور قادر الکلامی سے اردو شاعری کو تنگ نائے غزل کے محدود دائرہ سے نکال کر افلاک کی وسعتوں تک پہنچا دیا اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل میں لا کھڑا کر دیا۔ ملک کے طول و عرض میں اپنی زباندانی اور نت نئے خیالات کی جادوگری سے ایسا سکہ بٹھا دیا کہ بڑے بڑے شاعروں کو کنارے لگا دیا۔ وہ ترکیبوں تشبیہوں استعاروں اور محاوروں کے خالق تھے۔ ان کے بارے میں میرؔ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جوش نثر نگاری میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا طرز اسلوب معاصرین میں بالکل منفرد اور جداگانہ تھا۔ اس فن میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ یادوں کی برات کے علاوہ ان کی نثر کے اعلیٰ

نمونے روح ادب اور مختلف رسائل جیسے ہمایوں لاہور، زمانہ کانپور، کلیم دہلی اور آجکل وغیرہ میں وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ اگر ان کے اداریے اور متنوع المضامین یکجا کر کے مرتب کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔

حیدر آباد کے اخراج کے بعد جوش ہمیشہ عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی مالی زبوں حالی ایک ''اعلان'' سے نمایاں ہوتی ہے جو ماہنامہ ''کلیم'' دہلی بابت جنوری ۱۹۳۸ء صفحہ ۵ میں بعنوان ''امیری مشاعروں کی شرکت شائع ہوا تھا۔ چونکہ ماہنامہ کلیم کے پرچے نادر و نایاب ہیں اس لئے اعلان ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

> ''میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے جیسے قلیل الوسائل شخص کے لئے جو خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، اپنے اہل و عیال کو بھی زندہ رکھنا چاہتا ہے اور کچھ نہ کچھ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی بھی مالی خدمت کرنا چاہتا ہے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ شعور زود و زیاں سے نافر رہے۔ اور اس سرد مہر دنیا میں ایک لا ابالی انسان کی طرح زندگی بسر کر کے اپنے متعلقین کے حقوق کو کند چھری سے ذبح کر ڈالے۔ اسی لئے میں اپنے کو اس اعلان پر مجبور پاتا ہوں کہ اب میں اس وقت تک کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا جب تک مقامی مشاعرے کی شرکت کیلئے مبلغ ۲۵ روپۓ اور بیرونی مقامات کے واسطے (ملازم سمیت) سیکنڈ کلاس کرایہ آمد و رفت کے علاوہ میرے دیگر ضروریات اور ''کلیم'' کے اس مالی نقصان کی خانہ پری کے طور پر جو میری عدم موجودگی کے باعث ہمیشہ ہوتا رہتا ہے مزید سو ۱۰۰ روپے وصول نہ ہو جائیں گے۔''

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جوش کی نظموں نے سامراجی ایوان میں جو زلزلہ پیدا کیا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور حصول آزادی کے بعد جو کچھ بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس پر وہ خاموش نہیں رہے۔ افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ اردو دنیا اور آزاد ہندوستان نے انہیں یکسر فراموش کیا۔ کسی ادارے نے ان کا کوئی اسپیشل نمبر نہیں نکالا وہ آجکل دہلی کے کئی سال تک ایڈیٹر رہے۔

انکی تنگ نظری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ خصوصی نمبر تو در کنار جوش پر کوئی مضمون شائع کرنے کا روادار نہیں ہے۔ یہی حال لکھنؤ کے نیا دور اور اتر پردیش اردو اکادمی کا ہے بسیے لے دے کے شیعہ کالج لکھنؤ نے ایک سیمنار کا اہتمام کیا تھا۔ یہ وہی جوش تھے جو جھوم جھوم کے کہتے تھے۔

ایک دین نو کی لکھوں گا کتاب زر فشاں

ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر ہندوستان

راقم حروف کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت ہلال نقوی اپنے استاد کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وہ جوش کے سچے شیدائی ہیں اور ان کی بکھری ہوئی نگارشات کو جمع کرنے کے لئے فکر مند و کوشاں ہیں۔

اس وقت میرے پیش نظر ہلالؔ کی کتاب ''جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں'' ہے۔ اس کتاب سے جوش کے بارے میں نئی چیزیں سامنے آئی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی ہیں کہ ان کا ایک ایک جملہ دل و جگر کے پار ہوتا ہے۔ یہ کتاب جوش پر کام کرنے والوں کے لئے بڑی مفید ہوگی۔ بعض تحریریں ایسی اثر کرنے والی ہیں کہ غالبؔ کے طرز اسلوب کی یاد دلاتی ہیں۔ غالبؔ اپنے ایک شاگرد یوسف مرزا تخلص ناصرؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''یوسف مرزا۔ کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا''

علامہ رشید ترابی، باکمال اور یکتائے زمانہ خطیب آل محمدؐ تھے۔ ان کی آواز میں گھن گرج تھی۔ جب بھی ہم کشمیر میں ان کی شام غریباں کی مجلس سنتے تھے تو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ریڈیوں میں زلزلہ آرہا ہے۔ انکی وفات پر جوش ان کے صاحبزادے کو تعزیت نامہ میں لکھتے ہیں:۔

> ''اے میاں نصیر رو، جی بھر کے رو، اور روتے روتے جل تھل بھر دو۔ اس موت پر زمین بھی رو رہی ہے۔ آسمان بھی رو رہا ہے۔ میں بھی دل تھام کے روؤں۔ تم بھی سر پیٹ کے رؤو۔ نظر اٹھا کر دیکھو کہ تمہارے باپ پر جو دین خش گفتاری کے پیغمبر تھے موت طاری کر کے لیلائے فصاحت پر

بیوگی کا عذاب نازل کر دیا گیا۔ عروس بلاغت کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئی ہیں۔ شہر ابلاغ کو پامال کرڈالا گیا ہے۔ نگار حرف و حکایت کی نبضیں ڈبو دی گئی ہیں۔ مضائے سوگواری سے ''واحیسنا'' کی صدا چھین لی گئی ہے۔ طلاقت کا جنازہ نکال دیا گیا۔ معانی کی چاندنی گہنادی گئی ہے۔ الفاظ کی پنکھڑی توڑ دی گئی ہیں۔ خطابت کی رگوں کا خون جما دیا گیا ہے۔ جادو بیانی کی رگ جان تراش دی گئی ہیں۔ محراب کی زبان کو کاٹ ڈالا گیا۔ منبر کو گونگا بنادیا گیا ہے اور کھنکتے لہجے کی دھنک کو توڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں''

۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ء کے خط میں ہلال نقوی کو اپنی ضعف بصارت اور سماعت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''تمہارے خط کا جواب کیسے دیتا۔ ہاتھ تو کانپتے ہی تھے۔ اب قوت سماعت وبصارت نے بھی کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ چشمہ تو استعمال کرتا ہی تھا۔ اب آلۂ سماعت کا بھی سہارا لینا پڑ گیا ہے۔ یہ خط خود نہیں لکھ رہا۔ تف ہے جوش کی مجبوریوں کے اس دور پر سوچتا ہوں کہ اس کی کن کن ''نعمتوں'' کا شکرادا کروں۔

لکھنؤ سے تمہارا خط آیا۔ تو وہاں کے گلی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ لیکن جمیل مظہری کے انتقال کی خبر پڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہو گیا۔ ہائے جمیل مظہری؟ کیا کہوں؟ کیا لکھو؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا، کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آنسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی کوئی باقی ہو۔'' [1]

---

[1] جوش کی ایک نظم ''فیضان'' کے عنوان سے 'آجکل دہلی بابت نومبر ۱۹۵۲ء میں چھپی تھی۔ اس کا مطلع اور مقطع درج کئے جاتے ہیں۔

خوشا طالع! کہ راز این و آں بخشا گیا ہم کو
مقام فقر میں ناز شہاں بخشا گیا ہم کو

بحمد اللہ کہ جوش اس بدمذاقی کے زمانے میں
جمیل مظہری سا قدرداں بخشا گیا ہم کو

جوش کی نواسی صبوحی خاتون کے شوہر حسن ناصر خاں کا انتقال کراچی میں ہوا۔ جوش کا قیام اسلام آباد میں تھا وہ مجبور ولا چار تھے اور ان کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ نواسی کے پاس جا کر پرسا دیتے۔ یہ برصغیر کے سب سے بڑے شاعر اور تحریک آزادی کے نامور مجاہد کی حالت زار تھی

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کے خط میں صبوحی خاتون کو یوں پرسا دیتے ہیں:۔

''خون کے آنسو رو رہا ہوں تمہاری بیوگی پر۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ میں خود کراچی آتا مگر بیمار ہوں اور نادار بھی جسم میں دم ہے نہ جیب میں دام ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔

بیٹی۔ اپنا دل ٹھہراؤ۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ ناصر صرف میرا داماد نہیں تھا۔ بھائی بھی تھا۔ اس پر جتنا غم کیا جائے کم ہے۔ مگر اب صبر کرو صبا جانا ادھر تو درد دل کا ماجرا کہنا''

کتاب کے صفحہ ۷۹ میں جوش کے تاثرات ''حضرت اقبال'' کے بارے میں یوں درج ہیں:۔

''حضرت اقبال ایک شاعر بزرگ اور بحر بیکراں قسم کے انسان تھے اور ابلاغ پر بھی ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ جب میری سب سے پہلی تصنیف ''روح ادب'' ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی اس وقت انہوں نے ایک طویل تعریفی خط لکھکر مجھکو نصیحت فرمائی تھی کہ میں حافظ و ٹیگور کا راستہ چھوڑ دوں اور تصوف سے مہنہ موڑلوں۔''[1]

میں نے ان کی خدمت میں دس پندرہ بار شرف نیاز حاصل کرلیا۔ اور ہمیشہ ان کی شفقت بزرگانہ سے بے حد متاثر ہوا۔ انکے دماغ میں ایک مدت تک عقل عشق کے مابین جنگ ہوتی رہی۔ لیکن آخر کار اپنے آبائی و ذاتی میلانات کی بنا پر انہوں نے آفاقیت سے منھ موڑ کر اسلامیت کا دامن

---

[1] جوش کی روح ادب پہلی مرتبہ جولائی ۱۹۲۰ میں شائع ہوئی تھی۔ میرے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے۔ (ا۔ح)

پکڑلیا۔ نٹشے کو ''مافوق البشر'' اور اقبال کو ''مردمومن'' کی شدید آرزو تھی۔ لیکن دونوں کی آرزو بر نہیں آئی اس صورت حال سے نٹشے اور اقبال پر کوئی نکتہ چینی روا نہیں۔ اس لئے کہ

''گرنامہ ردکنند گناہ رسول نیست۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۷۷ء اسلام آباد''

کتاب کے صفحہ ۹۱ میں مورخہ ۱۸ جون ۱۹۷۰ء کو ''کچھ اپنے بارے میں'' جوش نے اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''بے شک میں اس روئے زمین کے تمام اکابر علم و اقطاب فکر کی دل سے عزت کرتا ہوں اور ہر چند کہ سقراط، ارسطو، فرانس بیکن، اسپی نوزا، والیٹر، ہیوم شوپنہار کانٹ، برگساں نٹشے اور برٹرنڈ رسل کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں۔ لیکن محمد مصطفیٰؐ کی بات ہی کچھ اور ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ تمام انبیائے عالم میں محمد عربی ہی وہ انسان اعظم ہیں کہ ازل سے گردش کرنے والا یہ آفتاب آج کے دن تک ان سے بہتر انسان طالع نہیں ہوا ہے۔

الٰہی گدا ہوں مجھے شاہ کر دے
ضمیر محمدؐ سے آگاہ کر دے''

ہلال نے صفحہ ۱۰۸ میں جوش کی نثر کا ایک ٹکڑا ''اجزاء عناصر'' کے عنوان سے دو حصوں میں نقل کیا ہے جو غیر مطبوعہ تھا اور اب پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا ہے۔ جوش کی قدرت زباں کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہو رہا ہے کہ گویا بشریت کے لباس میں وہ مجسمۂ لغات ہیں۔ اگر چہ یہ حصۂ نثر پڑھتے پڑھتے سر چکرانے لگتا ہے لیکن طرز ادا ایسی عجیب و غریب اور حیرت انگیز ہے کہ مسرّت کی لہریں دل و دماغ میں دوڑنے لگتی ہیں۔ ترکیبوں کی ندرت اور الفاظ کا بے ساختہ انتخاب لاجواب ہے۔ دیکھئے آنکھ ☆☆ کے لئے کیسے الفاظ استعمال کئے ہیں:۔

''باصرہ، بینائی، نظر، نگاہ، بصارت، چشم دید، نرگس، مژگاں، ابتک مردمک چشم، پردۂ چشم، حلقۂ چشم، چشمک نظارہ، تماشا، منظر، نظرگاہ، تماشا گاہ، بے بصر بابصر، جہاں بیں خوش نظر خوش نگہ جہاں تماشا، خوش مژگاں، دراز مژگاں، نرگس ناز، چشم فن نگر، دیدہ در، دل بینا، خاطر بینا، چشم

نگراں، خاطر نگراں (خاطر مشوش، خاتم چشم براہ) عالم دیدہ، دیدہ افروز
فلک ناضر (دیکھنے اور انتظار کرنے والا) نظاری، نظارگی''۔

نثر کے بعد کتاب میں ہلال صاحب نے جوش کے غیر مطبوعہ اشعار بھی دریافت کئے ہیں۔ان کے عنوان یہ ہیں ''صبح دیر سے بیدار ہونے پر ارتقا کا اعلان'' ''سہانی سزائیں'' سلام غیر مطبوعہ رباعیات۔ذیل میں سلاموں کے مقطع درج کئے جاتے ہیں۔

اے فلک جو نہیں دبتا ہے کسی طاقت سے
دیکھ ! وہ جوش بھی ہے بندۂ فرمان حسین
جوش کب سے ہوں یقیں سوز قضا میں پھر بھی
چشم یزداں مری جانب نگراں ہے اب تک

غیر مطبوعہ رباعیوں سے بھی لطف اندوز ہوجیئے۔

جب زیست پہ ہوتے ہیں ترانے ممنوع
تب کار سرود موت کراتی ہے شروع
ہر شاہ و گدا قبر میں ہوتا ہے غروب
ہم لوگ افق گور سے ہوتے ہیں طلوع

لو فقر میں شان تاجداری آئی
شاہانہ ادا سے خاکساری آئی
وہ جانب کربلا جھکا عرش بریں
وہ آل محمدؐ کی سواری آئی

اٹھی سوئے کبریا محمدؐ کی نگاہ
آدم کو ملا اپنی شرافت کا گواہ
سجدے میں قلم ہوا جو شبیرؓ کا سر

کج ہوئی فرق انساں پہ ..

کتاب اشاریہ (افراد و اشخاص، بہ ترتیب حروف تہجی) پر ختم ہوتی ہے۔

ہلال نقوی نے زیر نظر کتاب بڑی خوش اسلوبی اور حسن توجہ سے مرتب کی ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت شاندار اور جاذب نظر ہے۔ میں نے پوری کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے کیا۔ نہ معلوم مرتب نے یہ جواہر پارے کہاں کہاں سے حاصل کئے ہیں۔ کتاب پڑھئے، لطف اندوز ہوجیئے اور مرتب و مصنف دونوں کی داد دیجئے۔

جناب سید شغیر رضا نقوی صدر حیات اکیڈمی کراچی کا شکرہ ادا کرنا بھی میرے لئے ایک خوشگوار فریضہ ہے کہ انہوں نے کتاب کو شائع کر کے ''جوش مرحوم'' کی دسویں برسی کے موقعہ پر مرحوم کی ادبی خدمات کو یاد کیا۔ ہمیں امید ہے کہ جناب ہلال نقوی صاحب جوش کی پوشیدہ تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے لئے کوشاں رہیں گے۔

کاش ہندوستان میں بھی کوئی مرد بلند آہنگ غیب کے پردے سے باہر نکلتا اور جوش پر کوئی ٹھوس تحقیقی کام کرتا۔ یہاں کے دولت مند اردو اکادمیوں اور ترقی اردو بورڈ کے ناخداؤں کا یہ اولین فرض تھا کہ وہ برصغیر کے اس عظیم شاعر اور پیغمبر سخن کی تصانیف کو جو عرصے سے کمیاب ہیں دوبارہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ یہ لوگ اردو کی ''خدمت گذاری'' میں اس قدر محو ہیں کہ ان کی نگاہ میں جوش کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند کے ارباب بست وکشا جوش کی گراں سامایہ تصانیف کو ازسرنو شائع کرنے کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کرینگے۔

☆☆☆

Josh Bani (1) - A Literary Book Series

''جوش کے کلام کی قدر و قیمت میں کلام نہیں۔ کسی نظام کے
خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرأت اور دلیری چاہتا ہے۔ ہمارے
موجودہ ماحول میں اس احتجاج کی وقعت مختلف وجوہات کے
سبب اور بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اس بات میں شک نہیں کہ
جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ
بڑھایا اور انھیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب
گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اگر ان میں بہت سے ناکام اور
بے رنگ نقالی کی حد سے آگے نہیں گذر سکے تو اس کی ذمہ داری
ان کے اپنے کندھوں پر ہے۔ جو گنتی کے چند ایک لکھنے والے
ہمارے نئے ادب میں تھوڑا بہت اضافہ کرنے میں کامیاب
ہوئے ہیں انھیں جوش کی رفاقت اور گرمی گفتار سے یقیناً
اعانت اور امداد ملی ہے۔''

-- فیض احمد فیض